پرچہ تفسیر درجہ عالیہ (طلبہ) تنظیم المدارس کا
چار صد سے زائد سوالات مع جوابات پر مشتمل بہترین حل

تفہیم البیضاوی

تفسیر بیضاوی پہلا پارہ نصف اوّل
سوالاً جواباً (اردو)

از افادات

استاذ العلماء شیخ التفسیر

حضرت علامہ مولانا محمد صدیق ہزاروی دامت فیوضہم

تحریر و ترتیب

مولانا محمد جنید

مکتبہ تنظیم المدارس (اہل سنت) پاکستان

جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور 7634478

☆ نام کتاب : تفہیم البیضاوی

﴿پہلا پارہ نصف اوّل سوالاً جواباً﴾

☆ ازافادات : شیخ التفسیر حضرت علامہ مولانا محمد صدیق ہزاروی صاحب مد ظلہ

☆ مرتب : مولانا محمد جنید صاحب

☆ صفحات 256

☆ ہدیہ 240

☆ کمپوزنگ : محمد واحد بخش سعیدی

ناشر

مکتبہ تنظیم المدارس

جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور

فون : 7657842-7634478

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

کسی زمانے میں درس نظامی پر مشتمل کتب محض حصولِ علم کی خاطر پڑھی جاتی تھیں اس لیے طالب علم ہر کتاب کی زیادہ سے زیادہ شروح حاصل کرنے اور ان کے مطالعہ کی کوشش کرتا بلکہ اساتذہ کرام سے استفسار کا طریقہ بھی رائج تھا۔

لیکن جب سے درس نظامی کی اسناد پر ملازمتوں کا حصول اور دیگر شعبۂ حیات میں دخیل ہونے کا سلسلہ شروع ہوا امتحانات میں نہ صرف کامیابی بلکہ اچھے نمبروں میں کامیابی کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہو گیا۔

ان حالات میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے والے اساتذہ وطلباء نے ایک طرف درس نظامی کا نصاب پڑھنے پڑھانے اور دوسری جانب امتحان میں کامیابی کے لیے ضروری ذرائع اختیار کرنے کی راہ اپنائی ہے تا کہ طالب علم محض خلاصہ جات پر اکتفا کی وجہ سے علم سے بے بہرہ بھی نہ ہو اور امتحانات میں اچھے نمبروں میں کامیابی بھی حاصل کرے۔

الحمد للہ! اہل سنت وجماعت کی ممتاز دینی درسگاہ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں درسِ نظامی کے نصاب میں شامل نصاب بالاستیعاب پڑھایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ طلباء کو امتحانات کی تیاری کے لیے ضروری سوالات وجوابات پر مبنی لٹریچر مہیا کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی درجہ عالیہ کے پرچہ تفسیر کے سلسلے میں یہ کتاب "تفہیم البیضاوی" آپ کے ہاتھوں میں ہے راقم نے ۲۰۰۰ء میں موقوف علیہ کے طلباء کو تفسیر بیضاوی پڑھاتے ہوئے نصابی حصہ کو سوالات کی صورت میں لکھوایا اور جامعہ کے ہونہار

ذہین اور محنتی طالب علم مولانا محمد جنید زید مجدہ جو چند دنوں تک سند فراغ اور دستار فضیلت سے مشرف ہونے والے ہیں، نے ان سوالات کے جوابات کو تحریری شکل دی اور اب افادۂ علم کے لیے طباعت کے بعد یہ کتاب آپ کے پاس پہنچ چکی ہے۔

مولانا محمد جنید زید مجدہ ایک دیندار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں ان کے والد ماجد متقی پرہیزگار اور علم دوست شخصیت ہیں جنہوں نے مولانا موصوف کے علاوہ اپنے دیگر بچوں کو بھی حصول علم کی شاہراہ پر گامزن کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا محمد جنید سلمہ اللہ کو مستقبل میں دین متین کی خدمت کی توفیق رفیق عطا فرمائے آمین۔

طلبائے کرام کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ اصل کتاب محنت سے پڑھیں اور اس مجموعہ سے امتحان کی تیاری کے لیے استفادہ کریں۔ تاکہ وہ علمی دولت سے مالا مال ہو سکیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو علم دین کے حصول اور اس کی تبلیغ و تدریس کی ہمت و توفیق عطا فرمائے۔

آمین بجاہ نبیہ الکریم علیہ التحیۃ والتسلیم

محمد صدیق ہزاروی

۱۸ جمادی الاخری ۱۴۲۲ھ

۷ ستمبر ۲۰۰۱ء بروز جمعۃ المبارک

امام بیضاوی اور تفسیر بیضاوی

تفسیر ''انوار التنزیل واسرار التاویل'' المعروف تفسیر بیضاوی کے مصنف ابو سعید (ابو الخیر) عبداللہ بن عمر بن محمد بن علی غالباً ساتویں صدی ہجری کے نصف اول میں شیراز کی مضافاتی بستی ''بیضا'' میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے آپ بیضاوی کہلاتے ہیں۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے آپ کے والد ماجد عمر بن محمد ابو بکر بن سعد کے عہد میں قاضی کے عہدے پر فائز رہے۔

امام بیضاوی نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن مالوف میں حاصل کی اور بعد میں تبریز چلے گئے۔

تاج الدین سبکی کا بیان ہے کہ تبریز میں ایک علمی مجلس میں امام بیضاوی شریک ہوئے چونکہ آپ اس شہر میں غیر معروف تھے اور کسی سے شناسائی نہ تھی اس لیے مجلس کے آخر میں میں بیٹھ گئے مدرس نے دوران تدریس ایک لطیف نکتہ بیان کیا اور سامعین سے اس کی وضاحت کے لیے استفسار کیا امام بیضاوی اپنی جگہ سے اٹھے اور اس عمدگی سے بحث کی کہ خود مدرس حیران رہ گئے مدرس نے کہا ان ہی لفظوں میں ایک بار پھر بحث دہرا دیجئے چنانچہ امام بیضاوی نے گفتگو دہرادی اور فرمایا اس بحث میں ایک غلطی ہے آپ اس کی تصحیح کیجئے مدرس لاجواب ہو گئے اہل علم کی اس مجلس میں وزیر مملکت موجود تھا اس نے علامہ بیضاوی کو قریب بلایا اور احوال دریافت کیے امام بیضاوی نے عہدۂ قضا کے لیے درخواست کی تو وزیر نے خلعت فاخرہ سے نوازا اور عہدہ قضاء پر فائز ہو گئے۔

(تذکرہ مصنفین درس نظامی ص ۱۶۱)

یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ آپ نے ایک بزرگ شیخ محمد بن محمد کختائی کی معرفت

دوبارہ عہدۂ قضا کی خواہش کی شیخ نے سفارش کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ ایک فاضل عالم دین ہے جو امیر کے ساتھ نار (آگ) میں مصلے کی جگہ چاہتا ہے ان الفاظ کا قاضی بیضاوی پر گہرا اثر ہوا جس سے انہوں نے عہدۂ قضاء کا خیال ترک کر دیا اور شیخ کی صحبت میں رہ کر روحانی تربیت حاصل کی۔ (تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۲۱۹)

حضرت قاضی بیضاوی کی یادگار کتب (تصانیف) درج ذیل ہیں۔

(۱) شرح مصابیح امام بغوی (حدیث)

(۲) طوالع الانوار فی اصول الدین (علم کلام)

(۳) المصباح فی اصول الدین (علم کلام)

(۴) الایضاح لاصول الدین (علم کلام)

(۵) شرح المحصول (امام رازی کی تالیف المحصول کی شرح اصول فقہ سے متعلق ہے)

(۶) شرح المنتخب (اصول فقہ)

(۷) شرح مختصر ابن حاجب (اصول فقہ)

(۸) منہاج الوصول الی علم الاصول (اصول فقہ)

(۹) شرح التنبیہ لابی اسحاق شیرازی (۴ جلد)

(۱۰) الغایۃ القصویٰ فی درایۃ الفتویٰ۔

(۱۱) التہذیب والاخلاق فی التصوف۔

(۱۲) شرح الکافیہ (ابن حاجب کی مشہور کتاب کافیہ کی شرح)

(۱۳) کتاب فی المنطق

(۱۴) مختصر فی الھیۃ

(۱۵) لب اللباب فی علم الاعراب

(۱۶) موضوعات العلوم وتعارفھا

(۱۷) انوار التنزیل واسرار التاویل۔

(تذکرہ مصنفین درس نظامی ص۱۶۲)

تفسیر بیضاوی

قاضی بیضاوی کی تصنیف تفسیر بیضاوی کا مکمل نام "انوار التنزیل واسرار التاویل" ہے۔

آپ نے اپنی تفسیر کے آغاز میں سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"لمبے عرصے سے دل کی آرزو تھی کہ فن تفسیر میں ایک ایسی کتاب لکھوں جو ان اقوال کے انتخاب پر مشتمل ہو جو صحابۂ کرام، تابعین عظام اور دوسرے سلف صالحین سے منقول ہوتے چلے آرہے ہیں۔ نیز وہ کتاب لطیف نکات اور عمدہ لطائف پر مشتمل ہو جنہیں میں نے یا پہلے ائمہ تفسیر نے استنباط کیا ہے۔ اس کتاب میں متواتر قراءتوں کے علاوہ ان شاذ قراءتوں کا بیان ہو جو معتبر قاریوں سے روایت ہوتی چلی آرہی ہیں۔ میرے علمی سرمائے کی کمی اس راہ میں رکاوٹ تھی۔ یہاں تک کہ استخارے کے بعد میرے دل نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جس کام کی عرصہ سے خواہش ہے اُسے عزم بالجزم کے ساتھ شروع کر دوں اس نیت کے ساتھ کہ جب اس کتاب کو مکمل کر لوں تو اس کا نام "انوار التنزیل واسرار التاویل" رکھوں"

تفسیر بیضاوی کے مآخذ و مراجع

قاضی بیضاوی علیہ الرحمۃ نے عام طور پر اعراب، معانی اور بیان کی بحثیں تفسیر کشاف سے اخذ کی ہیں حکمت و کلام کی بحثیں امام رازی کی تفسیر کبیر سے اور اشتقاق و لغت کی لطیف بحثیں مفردات امام راغب اصفہانی سے لی ہیں۔ نیز اپنی طرف سے عمدہ لطائف و نکات کا اضافہ کر دیا ہے۔ جس سے کتاب کو لازوال شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی ہے گذشتہ سات سو سال سے یہ تفسیر علمائے کے زیر مطالعہ اور زیر درس چلی آ رہی ہے جو اس کی مقبولیت کی واضح دلیل ہے۔

تفسیر بیضاوی پر علمی کام

تفسیر بیضاوی پر کثرت سے حواشی و تعلیقات لکھی گئیں ہیں۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون اور نواب صدیق حسن خان نے ''الاکسیر'' میں بہت سے حواشی و تعلیقات کا ذکر کیا ہے۔ ہم بطور اختصار چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) حاشیہ شیخ محی الدین (۹۵۱ھ) آٹھ جلدوں میں بہت ہی مفید اور آسان ہے۔

(۲) حاشیہ شیخ مصلح الدین تین جلدوں میں ہے محشی سلطان محمد فاتح ترکی کے استاذ تھے اس حاشیے میں حواشی کشاف کی تلخیص پائی جاتی ہے۔

(۳) حاشیہ قاضی زکریا انصاری (۹۱۰ھ) اس میں صرف احادیث موضوعہ اور غیر صحیحہ پر تنبیہ کی گئی ہے جو مصنف نے دوسرے مفسرین کی اتباع میں نقل کی تھیں۔

(۴) حاشیہ علامہ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) انہوں نے اس کا نام ''نواھد الابکار وشواھد الافکار'' رکھا ہے یہ صرف ایک جلد میں ہے۔

(۵) حاشیہ ابو الفضل قریشی کی مشہور بہ گازرونی (۹۴۱ھ) یہ انتہائی لطیف اور دقیق

حاشیہ ہے۔علماء مدرسین میں متداول ہے۔

(۶) حاشیہ شمس الدین محمد بن یوسف کرمانی (۷۸۶ھ)

(۷) حاشیہ شیخ صبغۃ اللہ۔اسے اٹھارہ حواشی سے منتخب کر کے لکھا گیا ہے

(۸) حاشیہ محمد بن جلال الدین شروانی دو جلدوں میں ہے۔

(۹) حاشیہ ملا عوض (۹۹۴ھ) یہ تقریباً تیس جلدوں میں ہے۔

(۱۰) حاشیہ شیخ ابی بکر احمد بن صائغ حنبلی (۷۱۴ھ) اس کا پورا نام الحسام الماضی فی الیضاح غریب القاضی ہے۔اس میں زیادہ تر تفسیر بیضاوی کے الفاظ غریبہ کی تشریح ہے۔

(۱۱) تعلیقات وحواشی ملا خسرو (صرف ایک پارہ)

(۱۲) حاشیہ شیخ شہاب الدین خفاجی۔آٹھ جلدوں میں ہے اور ہماری رائے میں بیضاوی کے تمام حواشی میں سب سے فائق اور عمدہ ہے۔

(۱۳) تعلیق میر سید شریف جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ ہے۔

(۱۴) تعلیق شیخ الشیوخ سید محمد گیسو دراز المتوفی ۸۲۵ھ

بروکلمان نے تمام شروح وحواشی کی تعداد تراسی بتائی ہے اور ان کی فہرست مرتب کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تفسیر بیضاوی کو کتب تفسیر میں بہت اہمیت حاصل ہے اور یہ کشاف کے مقابلے میں علماء اہل سنت کا عظیم شاہکار ہے۔اگر مصنف تفسیر کے علاوہ باقی کتابیں نہ بھی لکھتے تو یہی تفسیر ان کے علمی مقام کو روشن کرنے کے لیے کافی تھی۔

(علم تفسیر اور مفسرین ص ۲۱۹ تا ۲۲۱)

امام بیضاوی رحمۃ اللہ نے ۶۸۴ھ یا ۶۸۰ھ بمطابق ۱۲۸۰ء یا ۱۲۸۶ء میں تبریز میں انتقال کیا اور اپنے شیخ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

تفسیر و تاویل

نوٹ: تفسیر و تاویل سے متعلق یہ تمام بحث علامہ مشتاق احمد چشتی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم ملتان کی تصنیف لطیف "علم تفسیر و مفسرین" سے من و عن نقل کی گئی ہے ہم حضرت شیخ الحدیث کے ممنون ہیں۔

تفسیر کی لغوی تحقیق

تفسیر کا مادہ فسر سے ہے اس میں کھولنے اور بیان کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ تفسیر اور تَفْسِرہ میں یہی مفہوم مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے یعنی زیادہ وضاحت اور کشف و بیان۔

اہل لغت کے ہاں یہ کلمہ ہے " کل شئ یعرف به تفسیر الشئ و معناه فهو تفسرته " ہر وہ چیز جس سے دوسری چیز کا مفہوم واضح ہو سکے وہ اس کے لیے تفسرہ کہلاتی ہے۔ قرآن مجید میں لفظ تفسیر کا اطلاق مضامین قرآن پر بھی آیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا۔ ولا یأتونک بمثل الا جئنک بالحق و احسن تفسیرا ۔ (فرقان: ۳۳)

ترجمہ: اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں ہم ٹھیک اور وضاحت میں بڑھا ہوا جواب آپ کو عنایت کرتے ہیں۔

قرآنی مضامین پر تفسیر کا اطلاق اس لیے کیا گیا ہے کہ ان میں حق کو کھول کر بیان کیا گیا ہے اور کسی قسم کا ابہام باقی نہیں رکھا گیا۔

بعض حضرات نے تفسیر کو سفر سے مقلوب مانا ہے اور وجہ مناسبت میں یہ تکلف کیا ہے کہ جس طرح سفر ہمسفر کے اخلاق کو واضح کر دیتا ہے اس طرح علم تفسیر سے بھی معانی قرآن کی وضاحت ہو جاتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ توجیہہ محض تکلف پر مبنی ہے۔

کیونکہ جب تفسیر کے لیے کلمہ فسر مادہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور معنی میں اشتراک بھی موجود ہے تو اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سلسلے میں امام راغب اصفہانی کی رائے یہ ہے کہ سفر کا مادہ اعیان واشخاص کے اظہار کے لیے ہے اور فسر کا مادہ معنی معقول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات راغب۔ص ۳۸)

تفسیر کا اصطلاحی مفہوم

علماء تفسیر نے اپنے ذوق کے مطابق مختلف تعریفیں کی ہیں بعض نے اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا "ھو علم باحث عن معنی نظم القرآن بحسب الطاقة البشرية" (کشف الظنون جلد اول ص ۴۲۷)

علامہ ابوحیان اندلسی نے تفصیل سے کام لیتے ہوئے کہا

ھو علم یبحث فیه عن کیفیة النطق بالفاظ القرآن ومدلولاتها واحکامها الافرادیة والترکیبیة ومعانیها التی تحمل علیها حالة الترکیب وتتمات لذلک۔ (مقدمہ تفسیر البحر المحیط ص ۲۶ مطبوعہ النصر الحدیثیہ ریاض)

ترجمہ: علم تفسیر وہ علم ہے جس میں درج ذیل امور سے بحث کی جاتی ہے۔

(۱) الفاظ قرآن کو ادا کرنے کا طریقہ (۲) الفاظ کے مدلولات کا علم

(۳) الفاظ کے مفرد اور مرکب ہونے کی حالت میں مختلف احکام کی معرفت۔

(۴) ان معانی کی پہچان جو ترکیب کی حالت میں الفاظ سے مراد ہوتے ہیں۔

(۵) دوسرے متممات ومتعلقات مثلاً نسخ کی پہچان اور اسباب نزول وغیرہ کا علم۔

علم تفسیر کا موضوع

علم تفسیر کا موضوع کلام لفظی ہے جو حضرت رسول کریم ﷺ پر متفرق اوقات میں

اتارا گیا۔ چنانچہ صاحب کشف الظنون فرماتے ہیں۔

موضوعه: كلام الله سبحانه وتعالیٰ الذی هو منبع كل حكمة ومعدن كل فضيلة (کشف الظنون جلد اول ص ۴۲۷)

ترجمہ: علم تفسیر کا موضوع اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام ہے جو ہر حکمت کا سرچشمہ اور ہر فضیلت کی کان ہے۔

غرض وغایت

علم تفسیر کی غایت یہ ہے کہ طاقت بشری کے مطابق کلام الٰہی کے معنیٰ مرادی کی معرفت حاصل کر کے اس پر عمل کیا جائے تا کہ دارین کی سعادتیں حاصل ہو سکیں۔ جیسا کہ صاحب کشف الظنون رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح فرمائی ہے۔

التوصل الى فهم معانى القران واستنباط حكمه ليفاز به الى السعادة الدنيوية والاخروية (کشف الظنون جلد اول ص ۴۲۷)

ترجمہ: معانی قرآن کی صحیح فہم تک پہنچنا اور حکم کا استنباط کرنا تا کہ دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل ہو۔

علم تفسیر کی اہمیت

علم تفسیر کی اہمیت اس کے موضوع سے ظاہر ہے۔ وہ علم جس میں کلام رب جلیل کے معنیٰ مرادی سے بحث کی جائے یقیناً وہ انتہائی اعلیٰ اور اشرف علوم میں سے ہوگا۔

حضرت رسول اکرم ﷺ نے تعلیم قرآن کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

خيركم من تعلم القرآن وعلمه (مشكوة المصابيح ص ۱۸۳)

ترجمہ: تم میں بہتر وہ ہے جو قرآن کریم کو سیکھے اور سکھائے۔

ظاہر ہے کہ قرآن سکھانے میں قرآنی مطالب کی تشریح وتفسیر بھی داخل ہے۔
یہی وجہ ہے حضور ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے دعا کرتے ہوئے فرمایا۔
اللھم علمه الکتاب ۔یا اللہ ان کو کتاب کا علم عطا فرما۔(صحیح بخاری ج ا ص ۵۳۱)
ایک اور روایت میں آتا ہے

اللھم فقهه فی الدین و علمه التاویل (لسان العرب ج ۱۱ ص ۳۳)
ترجمہ: اے اللہ ابن عباس کو دین کی سمجھ اور تاریل قرآن کا علم عطا فرما

قرآن فہمی ایک بہت بڑی نعمت ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے پاس قرآن ہے اور وہ فہم ہے جو اللہ تعالیٰ کسی بندے کو قرآن کریم سمجھنے کے لیے عطا فرماتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ روایت ہے کہ ایک بار آپ نے حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی تعریف کی۔ کسی نے عرض کیا آپ ان کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ آپ کا اپنا مقام بہت بلند ہے۔ فرمایا جابر کے پاس اس آیت قرآنی کا صحیح علم ہے جو سورۂ قصص کے آخر میں ہے۔

ان الذی فرض علیک القران لرادک الی معاد (القصص : ۸۵)
ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ جس نے آپ پر قرآن فرض کیا آپ کو واپس لوٹنے کی جگہ (مکہ) کی طرف ضرور واپس لے جانے والا ہے۔

صحابہ کرام کی طرح تابعین بھی اس علم کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

"**احب الخلق الی اللہ اعلمھم بما انزل**" (مقدمہ تفسیر قرطبی ص ۲۶)
ترجمہ: اللہ کی مخلوق میں وہ شخص سب سے زیادہ پسندیدہ ہے جو اس کی نازل شدہ کتاب کا صحیح علم رکھتا ہو۔

مشہور تابعی جناب شعبی نے جناب مسروق رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا کہ وہ ایک آیت کی تفسیر کے لیے بصرہ تشریف لے گئے معلوم ہوا کہ اس کی تفسیر جاننے والا ملک شام میں ہے آپ نے وہاں سے ملک شام کا سفر کیا۔ (مقدمہ تفسیر فتح القدیر و تفسیر قرطبی)

سعید بن جبیر کہتے ہیں:

من قرء القرآن ثم لم یفسرہ کان کا لاعمی او کالاعراب

(مقدمہ تفسیر ابن جریر ص ۸۱)

ترجمہ: جس نے قرآن پڑھا پھر اس کی تفسیر نہ سیکھی وہ اندھے کی طرح ہے یا جاہل بدو کے مشابہ ہے۔

ایاس بن معاویہ کہتے ہیں وہ لوگ جو قرآن پڑھتے ہیں اور اس کی تفسیر نہیں جانتے اس قوم کی طرح ہیں جن کے پاس رات کو بادشاہ کا تحریری فرمان پہنچے اور ان کے پاس چراغ نہ ہو جس کی روشنی میں اسے پڑھ سکیں۔ غرضیکہ علم تفسیر انتہائی اہم اور ضروری ہے اس علم کے بغیر قرآن مجید کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔

تاویل کا مفہوم اور تفسیر سے اس کی نسبت

تفسیر سے متعلقہ امور بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاویل کا مفہوم اور تفسیر سے اس کی نسبت کو واضح کیا جائے۔

علماء اہل لغت کی تصریح کے مطابق لفظ تاویل اَوْلٌ سے مشتق ہے اس کے معنی رجوع کرنے کے آتے ہیں۔ یا ایالۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سیاست اور تدبیر امور کے آتے ہیں۔ (لسان العرب ج ۱۱ ص ۳۲)

کتاب مبین میں لفظ تاویل انجام اور عاقبت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ھل ینظرون الا تاویلہ (الاعراف: ۵۳)

زجاج اس کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

هل ينظرون الى ما يؤول اليه امرهم من البعث

(تاج العروس ج ۷ ص ۲۱۵)

"کیا وہ منتظر ہیں اس چیز کے جس کی طرف ان کا معاملہ لوٹایا جائے گا۔یعنی بعث اور حشر وغیرہ"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا

فان تنازعتم فی شیء فردوه الى الله والرسول ان كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر ذلك خير واحسن تاويلا .(النساء : ۵۹)

ترجمہ: اگر تمہارا کسی امر میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ اگر تم اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔یہی امر اچھا ہے اور انجام کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے۔

کلام کے معنی مرادی پر لفظ تاویل ہمارے اصطلاحی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

چنانچہ آیات متشابہات کے بارے میں فرمایا۔

وما يعلم تأويله الا الله والراسخون فى العلم يقولون آمنا به (آل عمران: ۷)

ترجمہ: اس کی تاویل کو نہیں جانتا مگر اللہ تعالیٰ اور پختہ علم رکھنے والے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔

تعبیر خواب کے لیے بھی قرآن مجید نے تاویل کا لفظ استعمال کیا ہے۔چنانچہ ارشاد ہے۔

قال یا ابت هذا تاويل رؤياى من قبل (یوسف: ۱۰۰)

"یوسف علیہ السلام نے کہا یہ میرے خواب کی تعبیر ہے۔ جو میں نے بہت پہلے دیکھا تھا"

ابن منظور نے لسان العرب میں حضرت علی کا یہ قول نقل کیا ہے جو انہوں نے خوارج کے خلاف جہاد کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔

نحن ضربنا کم علی تنزیلہ فالیوم نضربکم علی تاویلہ

(لسان العرب ج ۱۱ ص ۳۴)

ترجمہ: ہم نے اس سے پہلے تمہارے خلاف تلوار چلائی تھی کیونکہ تم تنزیل قرآن کے منکر تھے اب تمہارے خلاف اس لیے جہاد کر رہے ہیں کہ تم تاویل قرآن کے منکر ہو۔

تاویل و تفسیر کے مابین نسبت کیا ہے اس میں علماء کا کافی اختلاف رہا ہے۔

(۱) علمائے لسان میں سے ابوالعباس مبرد اور ثعلب نحوی وغیرہ نے کہا ہے کہ تاویل و تفسیر ایک حقیقت کے دو نام ہیں۔ (تفسیر مجمع البیان جلد ۱ ص ۲۷)

(۲) امام راغب اصفہانی کا قول ہے کہ تفسیر عام ہے کتب الہیہ اور غیر الہیہ دونوں کے لیے لیکن تاویل کا لفظ صرف آسمانی کتابوں کے لیے خاص ہے۔ نیز یہ کہ تفسیر کا لفظ عموماً مفردات کی تشریح کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ تاویل کا اطلاق جملوں پر ہوتا ہے۔ (مفردات راغ اصفہانی ص ۳۸۷)

(۳) امام ابو منصور ماتریدی سے منقول ہے کہ تفسیر میں بتایا جاتا ہے کہ کلام الٰہی سے قطعی مراد کیا ہے اور تاویل میں قطعیت کے بغیر معانی محتملہ میں سے کسی ایک کو ترجیح دیتے ہیں۔ (مقدمہ تفسیر روح المعانی ص ۴ تا ۶)

(۴) شیخ سلیمان جمل نے کہا ہے کہ تفسیر وہ ہے جس کا ادراک صرف نقل سے ہو سکے۔ مثلاً اسباب نزول اور نسخ کا علم وغیرہ اور تاویل وہ ہے جس کا ادراک قواعد

عربیت سے ہو سکے گویا تفسیر کا تعلق روایت سے اور تاویل کا تعلق درایت سے ہے۔(مقدمہ فتوحات الہیہ المعروف جمل علی الجلالین)

(۵) ابن جوزی فرماتے ہیں کہ تفسیر ابہام اور خفا سے معنی مرادی کو واضح کرتی ہے اور تاویل اس کو ظاہر معنی سے پھیر کر دوسرے معنی کی طرف لے جاتی ہے جو دلیل کا محتاج ہے اگر دلیل کا اقتضاء نہ ہوتا تو اسے ظاہر پر چھوڑ دیا جاتا۔

(تاج العروس ج ۷ ص ۲۱۵)

(۶) سید مرتضےٰ زبیدی نے ابن کمال کا قول نقل کیا ہے کہ آیت قرآنی کو ظاہر معنی سے پھیر کر دوسرے مفہوم کی طرف لے جایا جائے۔ بشرطیکہ وہ معنی محتمل کتاب و سنت کے موافق ہو۔ مثلاً "یخرج الحی من المیت" کا یہ مفہوم کہ اللہ تعالیٰ مردہ انڈے سے زندہ جاندار نکالتا ہے۔ ظاہر تفسیر ہے اور اسکا یہ مفہوم کہ اللہ تعالیٰ مومن کو کافر سے اور عالم کو جاہل کی پشت سے نکالتا ہے یہ اس کی تاویل ہے۔(تاج العروس ج ۷ ص ۲۱۵)

(۷) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سورۂ قیامہ کی تفسیر کرتے ہوئے تاویل، تفسیر اور تحریف کا فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"تفسیر کلام عبارت است کہ سہ چیز درو مرعی باشد اول حمل کلمہ بر معنئ حقیقی خود یا مجاز متعارف خود دوم ملاحظہ سیاق و سباق آن کلمہ از اول تا آخر تا بے نسق و مختل نہ شود۔ سوم آنکہ فہم مشاہدانِ نزول وحی کہ حضرت پیغمبر علیہ السلام و صحابۂ کرام اند مخالف آن واقع نہ شدہ باشد و ہرگاہ یکے ازیں امور سہ گانہ فوت شود و دیگر باقی مانند آں را تاویل خوانند پس اگر اول فوت شود دوم و سوم برقرار مانند یا سوم فوت شود اول

ودوم برقرار ماند آں را تاویل بعید گویند و ہرگاہ مجموع امور سہ گانہ فوت شود آن را تحریف و مسخ ے گویند" (تفسیر فتح العزیز پارہ ۲۹ ص ۲۴)

ترجمہ: تفسیر وہ ہے جس میں کلمہ اپنے حقیقی یا مشہور مجازی معنی پر محمول ہو اس میں سیاق وسباق کی رعایت ہوتا کہ نظم قرآنی میں خلل واقع نہ ہو۔ صاحب وحی پیغمبر علیہ السلام اور صحابہ کرام کی تفسیر کے خلاف نہ ہو اگر ان تین باتوں میں سے کوئی ایک نہ پائی جائے تو اسے تاویل کہتے ہیں۔ اگر پہلی بات نہ ہو باقی دونوں پائی جائیں تو تاویل قریب ہے اگر دوسرا وصف موجود نہ ہو، پہلا اور تیسرا وصف موجود ہو یا تیسرا وصف نہ ہو لیکن پہلا اور دوسرا وصف موجود ہو تو اسے تاویل بعید کہتے ہیں اور اگر مجموعی طور پر تینوں باتیں نہ پائی جائیں تو اسے تحریف ومسخ کہیں گے۔

(۸) تاویل وتفسیر میں فرق کے متعلق علامہ شہاب الدین محمود آلوسی کی رائے یہ ہے کہ بادی النظر میں دیکھا جائے تو تاویل وتفسیر ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں ہر کشف میں ارجاع وتاویل کا مفہوم پایا جاتا ہے اور ہر ارجاع وتایل معنی کشف کو لازم ہے۔ البتہ عرف کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ تفسیر مدلول ظاہر کا نام ہے اور تایل سے مراد وہ اشارات قدسیہ ہیں جو عالم غیب سے اہل سلوک کے دلوں پر القاء کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کرام کے اشارات عموماً تاویل کے بغیر کیے جاتے ہیں۔ (مقدمہ تفسیر روح المعانی)

اس سلسلے میں ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ متاخرین کی اصطلاحات سے قطع نظر کر کے صرف محاورۂ قرآن کو مدنظر رکھا جائے۔ تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو بیان ظاہر الفاظ کے موافق ہو وہ تفسیر ہے اور جو بیان ظاہر ہو مگر قواعد عربی کے مطابق ہو چاہے وہ قطعی کیوں نہ ہو تاویل کہلاتا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے تینوں بظاہر خلاف شرع

کاموں کی حکمتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا تھا" ذلک تاویل ما لم تسطع علیہ صبرا " (الکہف:۸۲) یہ ان کاموں کی تاویل ہے جن پر (اے موسیٰ) آپ کو صبر کی طاقت نہ تھی"۔

پھر قابل غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متشابہات کے بارے میں فرمایا "وما یعلم تاویلہ الا اللہ " (آل عمران:۷) ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا"۔

اللہ تعالیٰ کے علم کی قطعیت تو شک وشبہ سے بالاتر ہے یہاں پر اسے بھی تاویل سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ البتہ یہ بات ضروری ہے کہ وہ ظاہر لفظ پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ بطور اشارہ اخذ کی جاتی ہے۔

تفسیر اور تاویل میں مختلف نسبتیں ہو سکتی ہیں بعض اوقات ان میں صرف لفظی اور اعتباری فرق ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضور رسول اکرم ﷺ نے " ولم یلبسوا ایمانھم بظلم " (انعام:۸۲) میں ظلم کی تاویل شرک سے فرمائی۔ (جامع ترمذی ج ۲ ص ۱۳۷)

گو ظاہر مفہوم میں ظلم کا مفہوم صرف تعدی اور تجاوز عن الحد ہے لیکن چونکہ شرک میں تعدی عن الحد کا مفہوم بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ اس لیے اس تاویل شرک سے کی گئی بعض اوقات تفسیر وتاویل میں منافات ہوتی ہے نہ موافقت جیسا کہ مقام ابراہیم کی یہ تاویل کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خلوص اور مقام خلت (اللہ تعالیٰ سے گہری دوستی) مراد ہے۔ یہ مفہوم ظاہر تفسیر کے منافی بھی نہیں اور کلی طور پر موافق بھی نہیں۔ صوفیا کرام کی تاویلات زیادہ تر اسی مفہوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یاد رہے صوفیاء کرام کے نزدیک ظاہر آیت پر ایمان ویقین ضروری ہے جب کہ فرقۂ باطلہ ملاحدہ ظاہر معنی کا انکار کرتا ہے۔ ان کے نزدیک تمام آیات میں باطنی معنی مراد ہیں جو ظاہر الفاظ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے ایسی تاویلات جو ظاہر تفسیر کے بالکل منافی ہوں تحریف کہلاتی ہیں۔ مثال کے طور پر صراط مستقیم سے عقل محض

مراد لینا۔ انعمت علیھم کا مصداق دولت مندوں کو قرار دینا اقامت صلوۃ سے مراد اصلاح معاشرہ اور ایتاء الزکوۃ سے ظاہری صفائی و پاکیزگی کا مفہوم مراد لینا یہ سب تاویلاتِ فاسدہ ہیں اور نا قابلِ اعتماد ہیں۔

مذکورہ بالا بحث کو ختم کرتے ہوئے اس بات کا اظہار فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ مذکورہ بالا اختلاف علماء مفسرین کے درمیان ہے علماء متکلمین کے مابین اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں۔ تمام متکلمین اہل سنت کے نزدیک تاویل کا مفہوم یہ ہے کہ ان نصوص کو جن میں بظاہر ذات باری تعالٰی کے متعلق تشبیہ کا شائبہ پایا جائے انہیں ظاہر معنی کے بجائے اپنے معانی کی طرف پھیرنا جو رب تعالٰی کی شان تنزیہ کے مناسب ہوں اسی بنا پر علماء متاخرین "یداللہ مغلولۃ" (المائدہ:۶۴) اور الرحمن علی العرش استوی" (طہ:۵) میں تاویل سے کام لیتے ہیں اور متقدمین تفویض سے کام لیتے ہیں۔

تفسیر بالرائے

تفسیر بالرائے کے جواز و عدم جواز میں علماء کا بہت اختلاف رہا ہے جو حضرات اسے ناجائز سمجھتے ہیں ان کے دلائل درج ذیل ہے۔

(۱) تفسیر بالرائے میں ظن و تخمین سے کام لیا جاتا ہے اور اپنے قیاس سے مراد خداوندی کا تعین کیا جاتا ہے جو ارشاد خداوندی۔ " وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون "۔ (الاعراف: ۳۳) کی روشنی میں قابل مذمت اور ممنوع ہے۔

(۲) تفسیر بالرائے کے بارے میں احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول خدا علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا

" من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوا مقعدہ من النار"

(سنن ترمذی ج ۲ ص ۱۲۳)

ترجمہ: جو شخص قرآن مجید کے متعلق صحیح علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔ اسی طرح حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

"من قال في كتاب الله برأيه فاصاب فقد اخطأ"

"(سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۱۵۸)

ترجمہ: جس نے کتاب اللہ میں اپنی رائے سے بات کی اس نے خطا کی چاہے اس نے درست بات بھی کہی ہو۔

(۲) صحابہ کرام اور تابعین عظام تفسیر بالرائے سے سخت گریز کرتے تھے چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مشہور ارشاد ہے۔

اَیُّ ارض تقلني وَاَیُّ سماء تظلني اذا قلت في كتاب الله برأيي او بمالا اعلم. (مقدمہ تفسیر ابن کثیر ص ۵)

ترجمہ: کون سی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا۔ جب میں کتاب اللہ کے بارے میں کوئی بات اپنی رائے یا صحیح علم کے بغیر کہوں۔

اسی طرح تابعین میں سے سعید بن مسیّب، عامر بن شراحیل شعبی وغیرہ سے روایات ملتی ہیں کہ وہ تفسیر بالرائے کے قائل نہیں تھے یعنی وہ اس سے سخت گریز کرتے تھے۔

جو لوگ تفسیر بالرائے کے حق میں ہیں وہ ان دلائل کے جواب میں کہتے ہیں۔

(۱) جہاں تک پہلی دلیل کا تعلق ہے اس کا جواب واضح ہے۔ ان تقولوا على الله مالا تعلمون " سے مراد تفسیر بالرائے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف غلط بات کی نسبت کرنا ہے مثلاً مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا وغیرہ مراد ہے۔ اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کا رد کیا جا رہا ہے جو اللہ جل مجدہ کی طرف غلط امور کی نسبت کرتے ہیں۔ ورنہ جہاں تک اجتہاد اور تدبر کا تعلق ہے قرآن حکیم میں

کہیں بھی اس کی ممانعت نہیں بلکہ ترغیب موجود ہے۔

ارشار ربانی ہے

افلا یتدبرون القران ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا

کثیرا۔(النساء : ۸۲)

ترجمہ: کیا وہ لوگ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے اگر یہ کتاب غیر اللہ کی طرف سے نازل ہوتی تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہے

کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا ایاتہ '(ص : ۲۹)

ترجمہ: ہم نے آپ کی طرف بابرکت کتاب اتاری تاکہ اس کی آیات میں غور وفکر کریں۔

اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں تدبر کی دعوت دی گئی ہے اگر تفسیر بالرائے کا دروازہ علی الاطلاق بند کر دیا جائے تو پھر تفکر اور تدبر کے لیے کہاں گنجائش رہے گی۔

(۲) جہاں تک روایات کا تعلق ہے تو ان کے متعدد جوابات ہو سکتے ہیں۔

(۱) ان حدیثوں میں متشابہات قرآنی کی تفسیر بالرائے سے روکا گیا ہے۔ نہ کہ محکمات کی تفسیر سے۔

(۲) یہاں پر رائے سے مراد اپنا نظریہ ہے یعنی اپنے رائے اور نظریے کو اصل بنا کر قرآن کو اس کے تابع کر دینا یہ حرام ہے نہ کہ مطلقاً رائے کا استعمال۔

(۳) یہاں پر تفسیر بالرائے سے مخالفت اس صورت میں ہے جب کہ آدمی آثار وسنن میں مہارت حاصل کیے بغیر تفسیر شروع کر دے یا ظاہر تفسیر کو سمجھے بغیر باطل معنی کے اشارات بیان کرنا شروع کر دے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص

دروازے سے گزرے بغیر وسط مکان تک پہنچنے کا دعویٰ کرے۔ (احیاء العلوم جلد اول ص ۲۶۲) صحابہ کرام اور تابعین سے جو تفسیر بالرائے کی مذمت مروی ہے اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ظاہر تفسیر کو سمجھے بغیر محض ظن و تخمین سے قرآن کی تفسیر کرنا ان حضرات کو پسند نہیں تھا نہ یہ کہ رائے اور فکر کا استعمال ممنوع ہے۔

محاکمہ

ہمارے خیال میں تفسیر بالرائے کے جواز و عدم جواز میں علماء مفسرین کا اختلاف محض رسمی اور لفظی ہے جو حضرات تفسیر بالرائے کے حق میں ہیں ان کے نزدیک تفسیر بالرائے سے مقصود قرآن فہمی کے لیے عقل و رائے کا صحیح استعمال ہے۔

تفسیر بالرائے کے حسب ذیل اقسام کے ممنوع ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

(۱) علوم ضروریہ میں مہارت حاصل کئے بغیر تفسیر کرنا۔

(۲) آیات متشابہات کی اپنی رائے سے تفسیر کرنا ایسی رائے کو قرآن نے اہل زیغ (ٹیڑھے دل والے) کا حصہ قرار دیا ہے۔

(۳) اپنی رائے کو اصل قرار دے کر قرآن کو اس کے تابع بنا کر تفسیر کرنا۔ جیسا کہ دور حاضر کے بعض نام نہاد مفسرین کا وطیرہ ہے۔

آخر میں اس بات کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ نواب صدیق حسن مرحوم نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں تفسیر بالرائے کے مذکورہ بالا اقسام اتقان اور کشف الظنون وغیرہ سے نقل کیے ہیں لیکن ان کے بعد تفسیر بالاستحسان والھوی والتقلید کہہ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ائمہ کرام کی پیروی کرنے والے جن لوگوں نے قرآنی آیات کی تشریح کی ہے وہ بھی تفسیر بالرائے کے زمرے میں داخل ہیں حالانکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر ائمہ اربعہ کے مقلدین نے آیات احکام کی تشریح میں اپنے اپنے امام کے اصول

ہے کہ اگر ائمہ اربعہ کے مقلدین نے آیات احکام کی تشریح میں اپنے اپنے امام کے اصول استنباط کی پیروی کی ہے تو نواب صاحب موصوف نے بھی اپنی تفسیر میں علامہ شوکانی صاحب فتح القدیر (تفسیر) کی تقلید فرمائی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی تفسیر قاضی شوکانی کی تفسیر کی تلخیص ہے۔ اور اس میں سلفی علماء کے اصول کو اپنانے کا التزام کیا گیا ہے لہذا ائمہ اربعہ کے مقلدین پر نواب صاحب کی برہمی اور خفگی بے معنی اور بے مقصد ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم۔
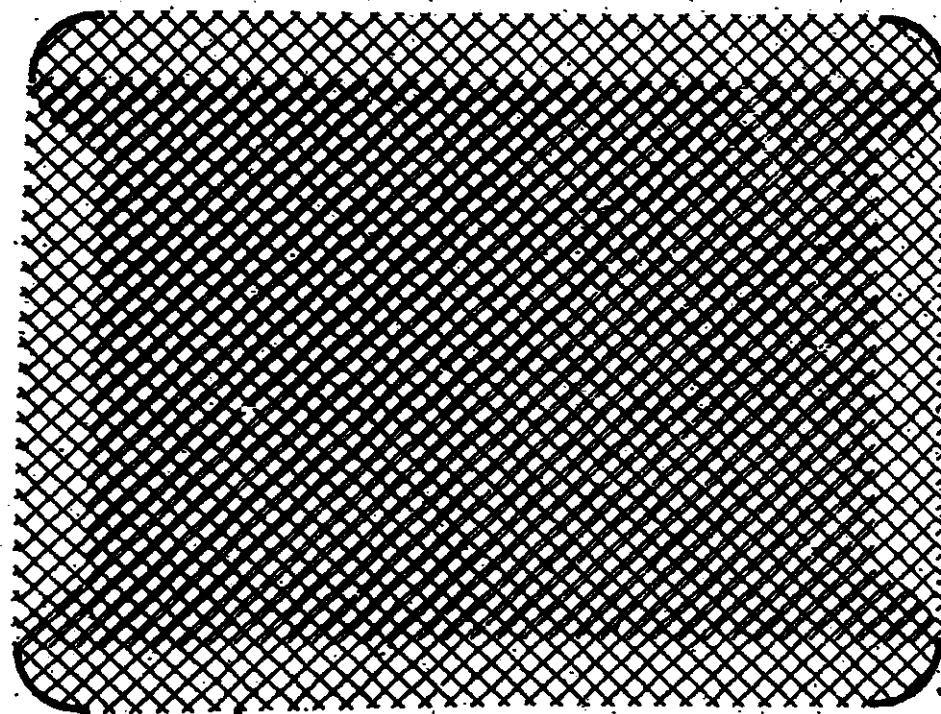
بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال نمبر۱: آیات محکمات وہ آیات ہوتی ہیں جن کے معانی واضح ہوتے ہیں
ان کے باوجود فَكَشَفَ قِنَاعَ الانْغِلاقِ عَنْ آيَاتٍ مُحْكَمَاتٍ فرمانے کی کیا وجہ
ہے؟

جواب: جواب سے پہلے ایک فائدہ:

كَشَفَ کا معنی ہے شی کے پردے کو زائل کر دینا۔ قناع اس کو کہتے ہیں جس
سے سر ڈھانپا جائے۔ اور انغلاق کا معنی ہے دروازے کو مضبوطی سے بند کر دینا۔ اور
محکم اسے کہتے ہیں جس کی مراد اس طرح مضبوط ہوں کہ اس میں احتمال واشتباہ نہ
ہو سکے۔ اور متشابہ اس کے خلاف ہے۔

اب سوال کا جواب یہ ہے کہ محکمات کے معانی نزول وحی سے پہلے اور لوگوں کے
سامنے پیش کرنے سے پہلے مخفی تھے اس اعتبار سے فَكَشَفَ الخ فرمایا گیا۔

سوال نمبر۲: تاویل اور تفسیر نیز حقائق اور دقائق میں فرق واضح کریں؟

جواب: الحقائق الاشياء تخفى معرفتها حتى تحتاج للنظر التام . وہ اشیاء
جن کی معرفت مخفی ہو یہاں تک کہ وہ نظر تام کی محتاج ہوں حقائق کہلاتی ہیں۔

الدقائق الامور المحتاجة لدقة النظر . وہ امور جو دقت نظر (باریک
بینی) کے محتاج ہوں دقائق کہلاتے ہیں۔

تاویل اور تفسیر میں کئی طرح سے فرق کیا جا سکتا ہے جن میں سے چند درج ذیل
ہیں۔

(۱) امام الماتریدی نے فرمایا تفسیر میں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ

ہے۔(اس طرح ہے) جب کہ تاویل میں چند احتمالات میں سے کسی ایک احتمال کو بغیر قطعیت کے ترجیح دی جاتی ہے۔

(۲) التفسیر ما یتعلق بالروایة۔ تفسیر کا تعلق روایت سے ہوتا ہے۔

والتاویل ما یتعلق بالدرایة. تاویل کا تعلق درایت سے ہوتا ہے۔

سوال نمبر۳: ہدایت حاصل کرنے کے سلسلے میں مکلفین کی تین اقسام ہیں جن کو مفسر نے فمن کان لہ قلب سے ویصلی سعیرا تک عبارت میں ذکر کیا ہے اس مضمون کو تفصیلاً ذکر کریں؟

جواب: جواب سے پہلے ایک تمہید ہے۔ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے لیکن اسے والدین یہودی ونصرانی بنادیتے ہیں۔ تو ہر بچہ فطرتِ اِسلام پر پیدا ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی قوت ودیعت کی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ دین حق کو بخوشی قبول کر لیتا ہے۔ یہ معاملہ اسی طرح چلتا ہے یہاں تک کہ جب وہ بالغ ہوجاتا ہے تو پھر وہ دو حال سے خالی نہیں ہوتا یا وہ دینِ اسلام پر قائم رہتا ہے یا اسے ترک کردیتا ہے بصورت ثانی وہ گروہ ہے جس کو مفسر نے ولم یرفع الیہ راسہ واطفأ نبراسہ یعش ذمیما ویصلی سعیرا. سے بیان کیا اور بصورت اول پھر دو حال سے خالی نہیں کہ یا تو وہ قرآن کے حقائق میں تفکر اور اس کے دقائق میں تدبر کرتا ہے نیز احکام کا نصوص قرآن سے استخراج کرتا ہے یا وہ ایسا ہے جو آیات میں تدبر وتفکر واستخراج تو نہیں کرتا لیکن اس کو غور سے سنتا ہے اس حال میں کہ وہ اپنے ذہن سے حاضر ہوتا ہے بصورت اول وہ ایسا گروہ ہے جس کو مفسر نے فمن کان لہ قلب سے بیان فرمایا اور بصورت ثانی وہ ایسا گروہ ہے جس کو مفسر نے او القی السمع وھو شھید سے بیان فرمایا۔ پھر ایسے دونوں گروہوں کے لیے فرمایا کہ وہ دونوں جہانوں میں تعریف کیے ہوئے اور خوش بخت ہیں۔

سوال نمبر۴: فیض اور جود کا لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کریں اور یہ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کو سخی کہہ سکتے ہیں یا نہیں اگر نہیں تو کیوں؟

جواب: فیض کا لغوی معنی ہے پانی کا اتنا کثیر ہونا کہ وادی اسے سمانہ سکے اور وہ اطراف میں بہہ نکلے۔ اور اصطلاح میں فیض ایسے فاعل کے فعل کو کہتے ہیں جو ہمیشہ وہ فعل کرے لیکن نہ کسی غرض کے لیے اور نہ ہی عوض حاصل کرنے کے لیے ہو۔

اور جود کا لغوی معنی ہے 'عمدہ ہونا' اچھا بنانا اور اصطلاح میں جود مناسب چیز کا فائدہ دینے کو کہتے ہیں لیکن یہ بھی نہ کسی غرض کے لیے ہوتا ہے اور نہ کسی عوض کے لیے۔

اللہ تعالیٰ کو سخی نہیں کہہ سکتے کیونکہ سخی بھی اگرچہ عطا کرتا ہے لیکن کسی غرض کے لیے کرتا ہے۔ جب کہ اللہ عزوجل غرض سے پاک ہے۔

سوال نمبر۵: علوم دینیہ، صناعات عربیہ اور فنون ادبیہ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتائیں کہ علم تفسیر تمام علوم میں سے اعظم وارفع کیسے اور کیوں ہے؟

جواب: علوم دینیہ۔ کل چھ ہیں۔ جن میں سے چار اصول

(۱) علم تفسیر (۲) علم کلام (۳) علم اصول فقہ (۴) علم حدیث

(۶) علم حدیث اور باقی دو اس کے فروع ہیں۔ (۱) علم اخلاق۔ (۲) علم فقہ۔

صناعات عربیہ: علم کیفیت عمل سے متعلق ہوگا یا نہیں اگر نہیں تو وہ مقصود فی نفسہ ہوگا اور اسم علم کے ساتھ خاص ہوگا۔ اگر علم کیفیت عمل کے ساتھ متعلق ہو اور اس سے مقصود بھی عمل ہو تو اسے صناعۃ کہتے ہیں، یہ عرف خاص میں ہے اور عرف عام میں علم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ قسم جو فقط نظر واستدلال سے حاصل ہو جائے جیسے طب' اسے علم کہتے ہیں۔ اور دوسری وہ قسم جو عمل کے بغیر حاصل نہ ہو جیسے (سینا) تو یہ قسم اسم صناعۃ کے ساتھ خاص ہے۔

فنونِ ادبیہ: (ان کو ادبیہ اس لیے کہتے ہیں کہ ادب بہ نفس محاورہ اور ... میں ان پر موقوف ہے) اور کبھی اسے علم عربیہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ ایسا علم ہے جس سے کلام عرب میں لفظاً وکتابۃً خلل سے بچا جاتا ہے۔

اس کی بارہ قسمیں ہیں جن میں سے آٹھ اصول اور ۴ فروع ہیں۔

اصول یہ ہیں:

(۱) لغت (۲) صرف (۳) اشتقاق (۴) نحو

(۵) معانی (۶) بیان (۷) عروض (۸) قافیہ

فروع یہ ہیں: (۱) خط (۲) قرضِ شعر (۳) انشاء (۴) محاضرات

علمِ تفسیر: ھو علم یعرف به معانی کلام اللّٰه تعالیٰ بحسب الطاقة البشرية

علمِ تفسیر ایسا علم ہے جس کے ذریعے کلام اللہ کے معانی طاقتِ بشریہ کے مطابق پہچانے جاتے ہیں۔ یہ علوم دینیہ کا سردار اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اس پر (اس کے ذریعے) نافذ ہوتا ہے۔ اور علوم دینیہ اس پر موقوف ہیں اور یہ تمام مسائل کلیہ کی بنیاد ہے۔

سوال نمبر ۶: سورۃ فاتحہ کے وہ تمام نام مع وجہ تسمیہ ذکر کریں جو امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیے ہیں؟

جواب: سورۃ فاتحہ کے ۱۴ نام ہیں۔

(۱) "فاتحۃ الکتاب" اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سے کلام اللہ کا آغاز ہوتا ہے۔

(۲) "ام القرآن" اس لیے اسے ام القرآن کہتے ہیں کہ یہ قرآن حکیم کا مبدأ اور مفتتحہ ہے۔ یا اس لیے ام القرآن کہا گیا ہے کہ یہ اللہ عزوجل کی ثناء اس کا حکم ماننا اور نہی کو ماننا اس کے وعدے و وعید کے بیان پر مشتمل ہے یا یہ مشتمل ہے احکام

نظریہ (عملیہ) اور احکام عملیہ پر جو سیدھے راستہ کا چلنا ہے اور خوش بختوں کے مراتب پر اور بد بختوں کے منازل پر اطلاع ہے۔

(۳) "اساس" اس لیے کہ یہ قرآن کی اصل و منشأ ہے۔

(۴) سورۃ الکنز۔ (۵) سورۃ الوافیہ (۶) سورۃ الکافیہ۔ ان تینوں کی وجہ تسمیہ وہی ہے جو ذکر کر دی گئی ہے۔

(۷) سورۃ الحمد (۸) سورۃ الشکر (۹) سورۃ الدعاء (۱۰) سورۃ تعلیم المسئلۃ ان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ سورۃ ان (حمد، شکر، دعا اور تعلیم مسئلہ) پر مشتمل ہے۔

(۱۱) "سورۃ الصلوٰۃ" اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ نماز میں واجب ہے یا یہ نماز میں مستحب ہے (جیسے فرض کی آخری دو رکعتوں میں امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک)

(۱۲) سورۃ الشافیہ (۱۳) سورۃ الشفاء اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے ھی شفاء لکل داء یہ ہر بیماری کے لیے شفاء ہے۔

(۱۴) "سورۃ سبع مثانی" اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ سات آیات ہیں۔ بالاتفاق۔

فائدہ: مثانی مُثَنّٰی کی جمع ہے یا یہ مَثْنٰی کی جمع ہے انکا معنی تکرار و اعادہ ہے۔ اور اسے مثانی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہے۔ یا انزال میں اس کا تکرار ہے۔

سوال نمبر ۷: سورۃ فاتحہ کی تعداد کے بارے میں تین اقوال ہیں ۸ آیات، ۶ آیات، ۷ آیات یہ کن کن بزرگوں کے اقوال ہیں اور انہوں نے ان آیات کی تقسیم کیسے کی ہے؟

جواب: آٹھ آیتوں کا قول امام حسن بصری رحمہ اللہ کا ہے۔ اور انہوں نے تسمیہ کو بھی ایک آیت شمار کیا ہے اور انعمت علیہم کو بھی اس طرح آٹھ آیتیں ہو گئیں۔ اور حسین جعفی رحمہ اللہ کے نزدیک چھ آیتیں ہیں انہوں نے نہ بسم اللہ کو الگ آیت تسلیم کیا نہ انعمت علیہم کو الگ آیت شمار اس طرح چھ آیتیں ہو گئیں۔

اور جمہور علماء کرام کے نزدیک سورۃ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں۔ احناف کے نزدیک بسم اللہ مستقل آیت نہیں باقی انعمت علیہم کو مستقل آیت مانتے ہیں۔ شوافع کے نزدیک بسم اللہ سورۃ فاتحہ کی جزء ہے وہ انعمت علیہم کو مستقل آیت نہیں مانتے۔ بعض شافعی بسم اللہ اور الحمدللہ کو ایک اور پہلی آیت شمار کرتے ہیں)

سوال نمبر ۸: سورۃ فاتحہ کو سبع مثانی کیوں کہتے ہیں اس کی دو وجہیں مصنف نے لکھی ہیں ان کی وضاحت کریں؟

جواب: وجہ اول: سبع تو اس لیے کہ اس کی بالاتفاق سات آیتیں ہیں اور مثانی اس لیے کہ یہ مثنّٰی یا مَثْنٰی کی جمع جس کا معنی تکرار ہے یہ سورۃ بھی چونکہ نماز میں بتکرار پڑھی جاتی ہے اس لیے اسے مثانی کہتے ہیں۔

وجہ ثانی: سبع کہنے کی وجہ تو مذکور ہو چکی اور مثانی کا معنی تکرار ہے یہ صورت بھی چونکہ انزال میں بتکرار نازل ہوئی اس لیے اسے سبع مثانی کہتے ہیں۔

نوٹ: وجہ ثانی تب درست ہو سکتی ہے جب یہ بات صحیح ہو کہ یہ سورۃ مدینہ منورہ میں بھی تحویل قبلہ کے وقت نازل ہوئی تھی۔ البتہ اس کا مکی ہونا یقینی ہے کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے ولقد اٰتینٰک سبعا من المثانی۔ اور یہ سورۃ حجر کی جزء ہے جو بالاتفاق مکی ہے۔

سوال نمبر۹: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۃ فاتحہ کی جزء ہے یا نہیں اس سلسلے میں مختلف مذاہب ذکر کرتے ہوئے احناف کا مؤقف مدلل بیان کریں اور شوافع کے دلائل کا جواب بھی دیں؟

جواب: قراء مکہ، قراء کوفہ اور فقہاء کوفہ وفقہاء مکہ مکرمہ، ابن مبارک امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تسمیہ سورۃ فاتحہ کی جزء ہے۔

شوافع کے دلائل:

(۱) امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ سے بسم اللہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا دو پہلوؤں کے درمیان جو کچھ ہے وہ کلام اللہ ہے۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا

ترجمہ: فاتحۃ الکتاب سات آیتیں ہیں جن میں سے پہلی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔

(۳) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۃ فاتحہ پڑھی (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ رب العالمین کو ایک آیت شمار کیا)

قراء مدینہ منورہ، قراء بصرہ، قراء شام اور ان علاقوں کے فقہاء کرام نیز امام مالک وامام اوزاعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بسم اللہ سورۃ فاتحہ کی جز نہیں (اسی طرح باقی سورتوں کی بھی جز نہیں) امام اعظم رحمہ اللہ سے اس کے بارے میں کوئی نص نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی یہ سورتوں کی جزء نہیں۔

احناف کے دلائل:

(۱) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ کان النبی ﷺ یقطع قراءتہ یقرأ الحمدللہ رب العالمین ثم یقف.

ترجمہ: نبی کریم ﷺ قراءت کی تقطیع فرماتے الحمد رب اللہ العالمین پڑھتے پھر وقف فرماتے۔

تو اس میں بسملہ کا ذکر نہیں تو معلوم ہوا اگر بسم اللہ سورۃ فاتحہ کی جزء ہوتی تو اسے بھی ساتھ پڑھتے۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسمت الصلوۃ بینی وبین عبدی نصفین. یہاں تک کہ آپ نے فرمایا بندہ کہتا الحمد للہ رب العالمین۔ اس میں بھی بسملہ کا ذکر نہیں۔

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے سیدنا ومولا احمد مجتبیٰ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی سیدنا ابو بکر صدیق سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی ان میں سے کسی نے بھی بسم اللہ جہر سے نہیں پڑھی۔ تو ان تمام دلائل سے معلوم ہوا بسم اللہ شریف سورۃ فاتحہ کی جزء نہیں۔

شوافع کے دلائل کا جواب

پہلی بات امام محمد بن حسن رحمہ اللہ نے جو فرمایا کہ دو پہلوؤں کے درمیان جو ہے وہ قرآن ہے تو اس سے بسم اللہ کا قرآن حکیم سے ہونا ثابت ہوتا ہے جس کے احناف قائل ہیں لیکن سورۃ فاتحہ کی جزء ہونا ثابت نہیں ہوتا جس کے احناف قائل نہیں ہیں۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت (انہی سے مروی وہ روایات جو احناف کے دلائل میں ذکر کی گئیں) ان کے متعارض ہیں اور متعارض روایات سے استدلال درست نہیں۔ اور یہ دلیل کہ تسمیہ چونکہ قرآن حکیم میں لکھی جاتی ہے اس لیے قرآن سے ہے تو پہلی بات تو یہ کہ سورتوں کے نام رکوعات اوقاف وغیرہ بھی قرآن حکیم میں لکھے جاتے ہیں جب کہ کوئی بھی انکا قرآن حکیم سے ہونے کا قائل نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دلیل سے بسم اللہ کا سورۃ فاتحہ کی جزء ہونا لازم نہیں آتا۔

سوال نمبر ۱۰: بسم اللہ کی با کا متعلق محذوف ہے امام بیضاوی نے اس سلسلے میں کونسا طریقہ اختیار کیا ہے اور کس طریقے کو غیر اولی قرار دیا اور کیوں؟

جواب: امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بسم اللہ کا متعلق اقرأ مؤخر قرار دیا اور ابدأ، ابتدائی کو غیر اولی قرار دیا۔ ابدأ کو غیر اولی تو اس لیے قرار دیا کہ یہ فعلِ فاعل کے مطابق نہیں جب کہ اقرأ میں مطابقت پیدا کرنے والی وجہ موجود ہے کہ میں اللہ کے نام سے قراءت کرتا ہوں جب کہ ابدأ متعلق ماننے سے ترجمہ یہ ہوگا کہ میں اللہ کے نام سے ابتدا کرتا ہوں اب

اس میں قراءت پر دلالت نہیں ہے اسی طرح ابتدائی مقدر ماننے سے پوشیدہ عبارت زیادہ ہو جائے گی جب کہ مقدر عبارت کم از کم نکالی جاتی ہے۔

سوال نمبر ۱۱: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں معمول کو مقدم کیوں کیا گیا مفسر نے اس سلسلے میں جو دلائل دیئے ہیں ان کی وضاحت کریں؟

جواب: معمول کو بسم اللہ میں اس لیے مقدم کیا گیا کہ یہ معمول زیادہ اہمیت والا ہے نیز یہ اختصاص پر زیادت دلالت کرتا ہے (کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ **تقدیم ما حقه التاخير يفيد الحصر والتخصيص**) دوسری بات یہ ہے کہ یہاں معمول کو مقدم کرنے میں تعظیم زیادہ ہے اسی طرح یہ وجود کے بھی زیادہ موافق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اسم قراءۃ پر مقدم ہے۔ مقدم اس لیے ہے کہ اسے قراءۃ کے لیے آلہ بنایا گیا ہے اس حیثیت سے کہ شرعاً فعل اس کے بغیر نہ تو مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی معتبر۔

سوال نمبر ۱۲: **وهذا وما بعده مقول على السنة العباد الى آخره.** یہ عبارت ایک اعتراض کا جواب ہے اعتراض اور جواب کی وضاحت کیجئے؟

جواب: اعتراض کی تقریر یہ ہے کہ مصنف نے فرمایا کہ با کا متعلق اقــــرا ہے اور با استعانت کے لیے ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ میں اللہ کے نام سے مدد طلب کرتا ہوں کیونکہ یہ (بسم اللہ) اللہ عزوجل کا کلام ہے تو مفسر علیہ الرحمۃ نے جواب دیا کہ یہ بندوں کی زبانوں پر پڑھا جاتا ہے۔ رہی بات یہ کہ اللہ عزوجل نے اسے فرمایا ہے تو یہ بندوں کو تعلیم دینے کے لیے ہے۔

سوال نمبر ۱۳: مصنف نے فرمایا حروف مفردہ کا حق یہ ہے کہ وہ مفتوح ہوتے ہیں اسکی وجہ بیان کریں اور یہ بتائیں کہ بسم اللہ کی باء کو کسرہ دینے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: حروف کی دو قسمیں ہیں (۱) مبانی (۲) معانی۔ حروف مبانی وہ حروف ہیں جن

سے کلمات مرکب ہوتے ہیں اور حروف معانی وہ ہیں جو کلمہ کی قسم ثالث ہے یہاں حروف سے مراد معانی ہیں حروف مبانی کے لیے اعراب و بناء میں سے کوئی حصہ نہیں کیونکہ اعراب و بناء کلمہ کے خواص میں سے ہیں جب کہ یہ کلمات ہی نہیں لیکن حروف معانی کلمات متعلہ ہیں لیکن اس میں اعراب تو لایا نہیں جا سکتا اس لیے ان کا حق مبنی ہونا ہے۔ اور بناء میں اصل سکون ہے اس لیے سکون خفیف ہے لیکن چونکہ یہ حروف ابتدائے کلام میں بھی آتے ہیں اور ساکن سے ابتداء نہیں ہو سکتی اس لیے ان کا یہ حق ہے کہ یہ فتحہ پر مبنی ہوں۔ (کیونکہ فتح خفت میں سکون جیسا ہے) یہی مصنف کے اس قول من حق الحروف المفردہ ان تفتح کی وجہ ہے۔
لیکن بسم اللہ میں باء جارہ کو کسرہ اس لیے دیا گیا کہ یہ لزوم حرفیت اور جر کے ساتھ خاص ہے (کیونکہ بعض حروف ایسے ہیں جن میں لزوم حرفیت ہوتی ہے جیسے واؤ لیکن لزوم جر نہیں کیونکہ یہ عطف کے لیے بھی آتے ہیں۔ اور بعض حروف ایسے ہیں جن میں لزوم جر تو ہوتا ہے لیکن لزوم حرفیت نہیں ہے۔ جیسے کاف کیونکہ کاف تشبیہ کا کبھی اسم بھی ہوتا ہے) اور حرفیت اور جر میں سے ہر ایک کے مناسب کسرہ ہے جر کے مناسب تو اس لیے تا کہ حرف کی حرکت اس کے اثر (جر) کے موافق ہو جائے۔ اور حرفیت کے مناسب اس لیے کہ وہ سکون کا تقاضا کرتا ہے اور سکون عدم حرکت کا نام ہے اور کسرہ بمنزلہ عدم حرکت ہے کیونکہ وہ قلیل الاستعمال ہے (اس لیے کہ یہ افعال میں نہیں پایا جاتا اسی طرح غیر منصرف میں بھی نہیں پایا جاتا) اسی وجہ سے بسم اللہ کی باء کو کسرہ دیا گیا۔

سوال نمبر ۴: لفظ اسم کے اشتقاق کے سلسلے میں کن دو جماعتوں کے درمیان اختلاف ہے اور کیا اختلاف ہے امام بیضاوی نے کس مسلک کو کس بنیاد پر ترجیح دی؟

جواب: لفظ اسم کے اشتقاق کے بارے میں بصریوں اور کوفیوں کا اختلاف ہے۔ بصری کہتے ہیں کہ اسم سمو سے مشتق ہے جب کہ کوفی کہتے ہیں کہ یہ وسم سے مشتق ہے امام

بیضاوی رحمہ اللہ نے بصریوں کے مذہب کو اس بنیاد پر ترجیح دی کہ اسماء اسامی، سمی سمیت، اسم کی جمع وتصغیر ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ جمع اور تصغیر اسماء کو اپنے اصل کی طرف لے جاتی ہیں تو اگر اسم وسم سے ماخوذ ہوتا تو ان مثالوں میں شروع میں واؤ ہونی چاہیے جب کہ ان مثالوں میں شروع میں واؤ نہیں تو معلوم ہو گیا کہ یہ اصل میں سمو تھا پھر واؤ کو حذف کیا گیا شروع کو مبنی بر سکون کیا گیا اور پھر ہمزہ وصل شروع میں لے آئے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سمو سے اس لیے مشتق مانا جاتا ہے کہ سمو کا معنی بلندی ہے اور چونکہ اسم بھی مسمی کے لیے رفعت اور اس کے لیے شعار ہے اس لیے اسے سمو سے مشتق مانا جائے گا۔

سوال نمبر ۱۵: ورد بان الهمزة الى آخره اس عبارت کا کیا مطلب ہے اور کس کو رد کیا جا رہا ہے؟

جواب: کوفیوں کا یہ مذہب ہے کہ اسم سمۃ سے بنا ہے اور اس کا اصل وسم تھا واؤ کو حذف کیا گیا اور اس کی جگہ ہمزہ وصل لے آئے۔ اور ایسا مذہب اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اعلال کم ہے۔ ورد سے علامہ بیضاوی نے کوفیوں کے رد کو ذکر فرمایا کہ عربوں کے کلام میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں جس کے صدر (اول) کو حذف کر کے اس پر ہمزہ وصل داخل کر دیا جائے۔ گویا کہ یہ کہا گیا کہ زیادہ تعلیل والا مذہب بہتر ہے ایسے مذہب سے جس میں تعلیل تو کم ہو لیکن وہ کلام عرب کے خلاف ہو)

سوال نمبر ۱۶: اسم سے مسمی مراد ہے یا غیر مسمی اس حوالے سے صاحب تفسیر نے کیا بحث کی ہے؟ اور سبح اسم ربک جیسی آیات سے کیا اعتراض کیا گیا اور اس کا کیا جواب دیا گیا اور اس سلسلے میں شیخ ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ نے کیا مسلک اختیار کیا؟

جواب: اسم سے مراد یا تو لفظ ہو گا یا مسمی اگر اگر اسم سے مراد لفظ ہو تو یہ مسمی کا غیر ہوتا کیونکہ لفظ ایسی آوازوں سے مرکب ہوتا ہے جو مقطوع ہوتی ہیں ثابت نہیں ہوتیں اور امتوں اور

زمانوں کے مختلف ہونے سے مختلف ہو جاتی ہے اسی طرح کبھی یہ متعدد ہو جاتی ہیں اور کبھی متحد جب کہ مسمّٰی اس طرح نہیں ہے۔ اگر اسم سے مراد لفظ ہو تو اس صورت میں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے سبح اسم ربک 'تبارک اسم ربک اب ترجمہ یہ ہوگا اپنے رب کے اسم کی تسبیح کرو۔ بڑی برکت والا آپ کے رب کا اسم حالانکہ تسبیح جو بیان کی جاتی ہے یہ ذات کی ہوتی ہے نہ کہ اسم (لفظ) کی اس طرح برکت والی بھی اللہ عزوجل کی ذات ہے۔ تو مفسر علیہ الرحمہ نے جواب دیا ان مثالوں میں اسم سے مراد لفظ ہے۔ اس لیے کہ جس طرح اللہ عزوجل کی ذات وصفات کی نقائص سے پاکی بیان کرنا واجب ہے اسی طرح وہ الفاظ جو اللہ عزوجل کی ذات کے لیے وضع کیے گئے ہیں انکی پاکی بیان کرنا بھی (فحش و بے ادبی سے) واجب ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ان مثالوں میں لفظ اسم زائد ہے۔

شیخ ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اسم سے مراد صفت ہے تو اس صورت میں یہ صفت کی طرح تقسیم ہو جائے گا (۱) نفس مسمی کی طرف جیسے وجود (۲) غیر مسمی کی طرف جیسے خلق واحیاء (۳) اور اس کی طرف جو نہ نفس مسمّٰی ہے اور نہ غیر مسمی۔ جیسے علم وقدرت۔

سوال ۱۷: بسم اللہ کی بجائے باللہ نہ کہنے کی وجہ بیان کریں اور یہ بھی بتائیں کہ بسم اللہ کے الف کو کیوں حذف کیا گیا؟

جواب: باللہ اس لیے نہیں کہا گیا کیونکہ برکت حاصل کرنا اور مدد طلب کرنا اللہ عزوجل کے اسم کو ذکر کرنے سے ہوتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ قسم اور برکت حاصل کرنے میں فرق کرنے کے لیے ایسا کیا گیا ہے (کیونکہ قسم کے لیے باللہ مستعمل ہے) اور بسم اللہ کے الف کو کثرۃ استعمال کی وجہ سے نہیں لکھا گیا۔ (اس کی جگہ با کو لمبا لکھ دیا جاتا ہے)

سوال نمبر ۱۸: اسم جلالت اللہ کی اصل کیا ہے اور مختلف مواد اشتقاق جو اسم میں بیان کیے گئے ہیں ان کا تفصیلی بیان مع معنی کریں وہ کتنی صورتیں ہیں اور کون کونسی ہیں؟

جواب: اسم جلالت کی اصل الـــــــہ ہے ہمزہ کو حذف کر دیا گیا اور اس کی جگہ الف لام لے آئے (اور لام کا لام میں ادغام کیا) تو لفظ اللہ ہو گیا۔

اسم جلالت کے اشتقاق کے بارے میں سات اقوال ہیں۔

(۱) یہ اله . الهة . الوهة. الوهية سے مشتق ہے اور یہ عبد کے معنی میں ہے۔

(۲) یہ آلهة سے مشتق ہے یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی حیران ہو جائے (کیونکہ عقلیں اللہ کی معرفت میں حیران ہوتی ہیں)

(۳) الهت انی فلان سے مشتق ہے اس کا معنی ہے سکنت الیه (میں نے اس سے سکون حاصل کیا' کیونکہ دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں اور روحیں اس کی معرفت سے سکون حاصل کرتی ہیں)

(۴) اله سے مشتق ہے جس کا معنی فزع من امر نزل علیه ہے۔

ترجمہ: اس امر کی وجہ سے وہ گھبرایا جو اس پر نازل ہوا۔

(۵) الهه غیره سے ماخوذ ہے اجارہ اس نے اس کو پناہ دی اس لیے کہ پناہ لینے والا اس کی طرف جزع فزع کرتا ہے اور وہ اسے پناہ دیتا ہے حقیقۃ (اگر وہ حق ہو) یا اس کے گمان کے مطابق (اگر وہ باطل ہو)

(۶) اله الفصیل سے مشتق ہے جب اونٹنی کا بچہ اپنی ماں سے چمٹے کیونکہ بندے بھی عاجزی کے ساتھ اس کی طرف مصیبتوں میں رجوع کرتے اور چنگل مارتے ہیں۔

(۷) ولـــه سے مشتق ہے جب کہ کوئی متحیر ہو جائے اور اس کی عقل زائل ہو جائے۔ اور اسکا اصل ولاہ تھا واؤ کو ہمزہ سے بدلا گیا کیونکہ اس پر کسرہ ثقیل تھا وجوہ میں ضمہ کے ثقیل

ہونے کی طرح۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں الاہ' اعاء' اشاخ' کی طرح ہے۔ یعنی اس کے شروع میں واؤ مکسور تھی اسے ہمزہ سے بدل دیا گیا تو الاہ ہو گیا لیکن اس مسلک کا رد اس کی جمع سے ہوتا ہے جو کہ الهة آتی ہے نہ کہ اولهة.

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں لاہ تھا جو کہ لاہ یلیہ لیھا لا ھا کا مصدر ہے یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی پردے میں ہو جائے اور بلند ہو جائے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی آنکھوں کے ادراک سے محجوب ہے ہر شئی پر' اور ہر اس شی سے جو اس کی شان کے لائق نہیں بلند ہے۔ اس لیے اسے الہ کہا جاتا ہے۔

سوال نمبر ۱۹: بعض حضرات کے نزدیک اسم جلالت مشتق نہیں ہے بلکہ ذاتِ مخصوصہ کا علم ہے ان کے موقف کے دلائل کی وضاحت کریں؟

جواب: دلائل: اس لیے کہ اسم جلالت اللہ موصوف ہوتا ہے صفت نہیں بنتا معلوم ہوا کہ یہ علم ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسماء باری تعالیٰ میں سے ایسا اسم ہونا چاہیے جس پر اس کی صفات جاری ہوں اور اسم جلالت اللہ وصف ہوتا تو لا الہ الا اللہ الرحمن کی طرح کلمۂ توحید نہ رہتا۔ کیونکہ رحمٰن شرکت سے مانع نہیں۔

سوال نمبر ۲۰: و الاظھر انہ وصف فی اصلہ الخ اس عبارت میں جو مسلک اختیار کیا گیا ہے وہ کیا ہے اور اس کے لیے کیا دلائل دیئے گئے ہیں۔؟

جواب: و الاظھــــــر سے یہ مسلک بیان کیا گیا کہ اسم جلالت اللہ اصل میں وصف تھا لیکن جب یہ بات اس پر غالب آ گئی کہ وہ اس کے غیر میں مستعمل نہیں تو یہ علم کی طرح ہو گیا جس طرح کہ ثــریـا اور صـعـق (کیونکہ یہ دونوں اصل میں وصف تھے تو غلبے کی وجہ سے علم کی طرح ہو گئے ثــریـا ثــروی کی تصغیر ہے مال دار عورت کو کہتے ہیں اب یہ ستاروں کا علم ہو گیا

کیونکہ یہ ستارے بھی کثیر بنتے ہیں جگہ کی قلت کے ساتھ ساتھ اور صعق شدید آواز کو کہتے ہیں جب کہ یہ لقب ہو گیا خویلد بن نفیل کا تو اس کو علم کے قائم مقام کر دیا گیا اوصاف کے اس پر جاری ہونے میں اور اس کے وصف بننے کے امتناع میں اور شرکت کے احتمال کے اس کی طرف راہ پکڑنے میں۔ اور اس مسلک کے اظہر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ لفظ اللہ اگر اللہ تعالیٰ کی فقط ذاتِ مخصوصہ پر دلالت کرے تو اللہ عزوجل کے ارشاد وھو اللہ فی السموت کا ظاہر صحیح معنی کا فائدہ نہ دے گا۔ (کیونکہ اس صورت میں لفظ اللہ شخص پر دال ہوگا اور معنی یہ ہوگا وہی ذات آسمان میں ہے اور آسمان کا اللہ عزوجل کے لیے ظرف ہونا لازم آئے گا حالانکہ اللہ تعالیٰ مکان سے پاک ہے) اور اگر وصف مانا جائے تو معنی یہ ہوگا وہ معبود ہے اس میں اور یہ صحیح ہے کیونکہ معبودیت وصف کے اعتبار سے ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اشتقاق کا معنی (دو لفظوں میں ایک لفظ کا دوسرے لفظ میں معنی اور ترکیب میں شریک ہونا) اسم جلالت اور ان اصول کے مابین جو ذکر کیے گئے (الہ وغیرہ) حاصل ہے لہذا یہ ابتداءً وصف ہوگا نہ کہ علم۔

سوال نمبر ۲۱: رحمن اور رحیم میں کس معنی کا مبالغہ ہے اور ان کا مادۂ اشتقاق کیا ہے نیز واسماء اللہ تعالیٰ انما توخذ باعتبارات الغایات الخ میں کس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے؟

جواب: رحمن اور رحیم میں رحمت کے معنی کا مبالغہ ہے انکا مادۂ اشتقاق **رحم** ہے۔

اسماء اللہ الخ یہ اس اعتراض کا جواب ہے کہ رحمت کا لغوی معنی رقتِ قلب ہے حالانکہ اللہ عزوجل رقت قلبی سے پاک ہے تو مفسر نے جواب دیا کہ ایک ہوتے ہیں اسباب اور دوسرے نتائج تو اسماء اللہ میں غایات کا اعتبار کیا جاتا ہے تو رقتِ قلبی کی غایت یہ ہے کہ دوسرے کی ضرورت پوری کر دینا اور اسکی مشکل کو دور کر دینا تو رحمن و رحیم

میں یہی مراد ہے۔

سوال نمبر۲۲: رحمن، رحیم سے ابلغ ہے اس کی وجہ کیا ہے اور یہ بتائیں کہ بعض اوقات یا رحمن الدنیا کہا جاتا ہے اور بعض اوقات یا رحیم الاخرۃ ۔اس تضاد کی وجہ تحریر کریں؟

جواب: رحمن رحیم سے ابلغ اس لیے ہے کہ لفظِ رحمن میں حروف زیادہ ہیں لفظ رحیم سے اور لفظ کی زیادتی معنیٰ کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔اور کبھی ان کو کمیت کے اعتبار سے لیا جاتا ہے تو اس صورت میں یا رحمن الدنیا کہا جاتا ہے کیونکہ یہ مؤمن اور کافر دونوں کو شامل ہے۔اور کبھی اسے کیفیت کے اعتبار سے لیا جاتا ہے پھر کہا جاتا ہے یا رحمن الدنیا والاخرۃ ویا رحیم الدنیا اور کبھی یا رحیم الاخرۃ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ مومن کے ساتھ خاص ہے۔

سوال نمبر۲۳: لفظِ رحمٰن کو لفظِ رحیم پر مقدم کرنے کی مُصنف علیہ الرحمہ نے کتنی اور کونسی کونسی وجوہ بیان کی ہیں تفصیل سے ذکر کریں؟

جواب: مصنف نے اس کی چار وجوہ بیان کی ہیں۔

(۱) رحمتِ دنیا مقدم ہے(۲) لفظ رحمٰن علم کی طرح ہو گیا ہے کہ اس کے ساتھ غیر اللہ موصوف نہیں ہوتا۔

(۳) رحمٰن نے جب بڑی بڑی اور اصول نعمتوں پر دلالت کی تو پھر رحیم کو ذکر کیا گیا تا کہ یہ ان نعمتوں کو شامل ہو جائے جو ان عظام نعمتوں میں سے رہ گئی ہیں پس یہ اس کے لیے تتمہ اور ردیف کی طرح ہو جائے گا۔

(۴) آیتوں کے آخر کی حفاظت کرنے کے لیے رحمٰن کو مقدم کیا (جس کو رعایت فواصل بھی کہتے ہیں)

سوال نمبر۲۴: لفظ رحمن کو کس بنیاد پر غیر منصرف پڑھا جاتا ہے حالانکہ نحوی قاعدے کے مطابق یہ منصرف بھی ہو سکتا ہے اور غیر منصرف بھی؟

جواب: لفظ رحمن کے اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہونے نے اس بات کو ممنوع قرار دیا کہ اس کی کوئی مؤنث ہو اب اکثر کے نزدیک الف نون زائدتین فی الصفة کے غیر منصرف ہونے کے لیے شرط انتفاء فعلانة ہے اور بعض کے نزدیک وجودِ فُعْلٰی تو ہم اغلب یعنی انتفاء فعلانة کا اعتبار کرتے ہوئے اسے غیر منصرف پڑھتے ہیں۔

سوال ۲۵: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کے ذکر کو کیوں خاص کیا گیا وجہ بیان کریں؟

جواب: اس لیے تاکہ عارف جان لے کہ اس بات کا مستحق کہ اس سے تمام امور میں مدد طلب کی جائے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے جو تمام عاجل آجل جلیل وحقیر نعمتوں کا عطا فرمانے والا ہے۔ پس وہ اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ جناب باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے اور توفیق کی رسی کو مضبوطی سے تھام لے اور اپنے باطن کو اس کے ذکر میں مشغول رکھے اور اسی سے مدد طلب کرے۔

سوال نمبر۲۶: حمد، مدح اور شکر کی تعریف ذکر کریں نیز یہ بتائیں کہ ان میں سے خاص کیا ہے اور عام کیا ہے یہ تقابل حمد اور مدح کے درمیان نیز حمد و مدح اور شکر کے درمیان بیان کریں؟

جواب: حمد: کسی کی اختیاری خوبیوں کے پیش نظر اس کی طرف اچھے کلمات کی نسبت کرنا چاہے وہ خوبیاں نعمت ہوں یا غیر نعمت۔

مدح: یہ بھی کسی کی اچھی خوبیوں پر ثناء ہوتی ہے لیکن اس میں اختیاری کی قید نہیں ہے (چاہے وہ خوبیاں اختیاری ہوں یا غیر اختیاری)

شکر: یہ نعمت کے مقابلہ میں ہوتا ہے چاہے زبان سے ہو یا دل سے یا اعضاء سے۔

متعلق کے اعتبار سے حمد اور مدح عام ہیں (کیونکہ یہ نعمت اور غیرِ نعمت دونوں کے مقابلے میں ہوتے ہیں) اور شکر خاص ہے (کیونکہ یہ فقط نعمت کے مقابلے میں ہوتا ہے) اور مورد کے اعتبار سے شکر عام ہے (کہ یہ دل زبان اور اعضاء سے ہوتا ہے) اور حمد جو مدح مورد کے اعتبار سے خاص ہیں (کہ یہ فقط لسان سے ہوتے ہیں)

محمود علیہ کے اعتبار سے حمد خاص ہے (کیونکہ یہ اختیاری خوبیوں پر ہوتی ہے) اور مدح عام ہے (کیونکہ یہ اختیاری و غیر اختیاری دونوں قسم کی خوبیوں پر ہوتی ہے)

سوال نمبر ۲۷: حمد، شکر کے شعبوں میں سے نعمت کو زیادہ ظاہر کرنے والا شعبہ ہے اس کی وجہ اور اسکی تائید میں حدیث شریف ذکر کریں اور یہ بھی بتائیں کہ کیا اس طرح حمد، شکر کا جزءِ قرار نہیں پاتی اس کا کیا جواب ہے؟

جواب: حمد، شکر کو زیادہ ظاہر کرنے والا شعبہ اس وجہ سے ہے کہ اعتقاد مخفی ہوتا ہے اور اعضاء سے شکر میں بھی ریا کا احتمال ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا "حمد، شکر کی اصل ہے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا اس شخص نے جس نے اس کی حمد نہ کی"

حمد، شکر کی جز قرار نہیں پاتی، یہ جز تب قرار پاتی جب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد (الحمد رأس الشکر) سے مراد یہ ہوتا ہے کہ حمد، شکر کی حقیقۃً جزء ہے حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ یہ تشبیہ بلیغ کے طور پر فرمایا گیا، کیونکہ حمد، شکر کے شعبوں میں سے اجل اور ادل ہے تو اسوجہ سے حمد، شکر کی جزء کی طرح ہوگی بلکہ اس کے اجزاء میں سے اہم ترین جز ہوگا اس طرح کہ شکر کے اقسام میں سے جب حمد نہ پائی جائے تو شکر بھی معدوم ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۲۸: حمد، شکر، ذم اور کفران میں سے کون کس کے مقابلے میں ہے؟

جواب: ذم، حمد کے مقابلے میں ہے اور کفران، شکر کے مقابلہ میں ہے۔

سوال نمبر ۲۹: امام بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ الحمد میں اصل نصب ہے آپ یہ بتائیں کہ رفع کی طرف عدول کی بنیاد کیا ہے؟

جواب: رفع کی طرف عدول اس وجہ سے کیا گیا تا کہ حمد کے عموم اور اس کے ثبات پر دلالت کرے نہ کہ اس کے تجدد وحدوث پر (کیونکہ اس طرح یہ جملہ اسمیہ ہو گیا جو کہ دوام وثبات پر دال ہے)

سوال نمبر ۳۰: الحمد پر الف لام کونسا ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: اس پر الف جنس کا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اشارہ کرنا اس بات کی طرف جس کو ہر کوئی جانتا ہے حمد کہلاتا ہے یا اس پر الف لام استغراق کا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حمد حقیقت میں تمام کی تمام اللہ عزوجل کے لیے ہے کیونکہ ہر بھلائی کو وہی عطا فرماتا ہے واسطے کے ساتھ یا بغیر واسطہ کے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وما بکم من نعمة فمن اللہ (تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ عزوجل کی طرف سے ہے) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ حی، قادر مرید اور عالم ہے کیونکہ حمد کا وہی مستحق ہوتا ہے جس کی یہ شان ہو۔

سوال نمبر ۳۱: لفظ رب صرفی اعتبار سے کیا ہے اور اس کا معنیٰ کیا بنتا ہے؟

جواب: لفظ رب اصل میں مصدر ہے جو کہ تربیت کے معنیٰ میں ہے (تربیت کہتے ہیں شی کو اس کے کمال تک Step by Step پہنچانا) اللہ عزوجل کی صفت اس سے مبالغہ کے طور پر لائی گئی ایک قول یہ بھی ہے کہ رب صفت مشبہ ہے رب یربہ سے پھر مالک کا نام اس کے ساتھ رکھا گیا کیونکہ وہ مملوک کی حفاظت وتربیت کرتا ہے۔

سوال نمبر ۳۲: لفظ عالمین عالم کی جمع ہے اس سے کیا مراد ہے نیز العلمین پر الف لام لانے نیز جمع کے لیے وہ طریقہ اختیار کرنے جو ذوی العقول کے لیے ہوتا ہے، کی کیا وجہ

ہے؟

جواب: اس سے مراد اس شی کا اسم ہے جس سے صانع کی پہچان ہوتی ہے۔ اور وہ ماسوی اللہ ہے (جواہر و اعراض میں سے) ذوی العقول والی جمع اس لیے لائی گئی (حالانکہ اس میں غیر ذوی العقول بھی شامل ہیں) کہ ذوی العقول کو غیر ذوالعقول پر غلبہ دیا گیا۔

سوال نمبر ۴۳: انسان کو تمام کائنات کے مقابلے میں رکھا گیا ہے قرآن پاک کی کسی آیت سے اس بات کا ثبوت دیں یہ بھی بتائیں کہ اگر رب العلمین کو منصوب پڑھیں تو اس کی کیا وجوہ ہو سکتی ہیں؟

جواب: آیت وفی انفسکم افلا تبصرون۔ (اور تمہاری اپنی جانوں میں تو کیا تم دیکھتے نہیں) تو پہلے کائنات و عالم میں غور و فکر کرنے کا حکم فرمایا گیا) اس کے مقابلہ میں یہ آیت ارشاد فرمائی گئی اگر رب العلمین کو منصوب پڑھیں تو یہ یا مدح کی بناء پر منصوب ہوگا یا نداء کی بناء پر یا اس فعل مقدر کی بناء پر جس پر حمد دلالت کرتی ہے۔ (اَحْمَدُ)

سوال نمبر ۴۴: لفظ مالک کو مَلِک بھی پڑھتے ہیں دونوں میں فرق کیا ہے مختار قول کونسا ہے اور اس کی دلیل کیا ہے؟

جواب: مالک اس ذات کو کہتے ہیں جو اعیان مملوکہ میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور یہ مِلک سے ماخوذ ہے۔ اور مَلِک اس ذات کو کہتے ہیں جو ماموریں میں امر و نہی کے ساتھ تصرف کرے اور یہ مُلک سے ماخوذ ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہوا کہ مالک صرف مملوکین میں تصرف کرتا ہے اور مَلِک ان تمام میں جن کو وہ حکم دیتا ہے۔ اور مختار قول بھی ملک ہی ہے اس کی ایک تو یہی دلیل ہے جو ابھی مذکور ہوئی اور دوسری دلیل اللہ عزوجل کا ارشاد لمن الملک الیوم ہے تو اس میں مُلک کا لفظ ہے جس سے مَلِک بنتا ہے تو چونکہ اس دن باقیوں کی بادشاہت کی نفی کی گئی ہے اس لیے اس کے مقابل للہ الواحد

القہار سے اللہ تعالیٰ کے لیے بادشاہت کا اثبات ہوگا جس کے لیے لفظ مَلِک بولا جاتا ہے نہ کہ مالک۔

سوال نمبر ۳۵: لفظ مالك کے اعراب کے سلسلے میں رفع نصب مُنوّن اور غیر مُنوّن کا ذکر بھی کیا گیا ہے ان تمام صورتوں کی وضاحت سے وجہ بیان کریں؟

جواب: لفظ مالک کو جب منصوب پڑھیں تو یہ یا تو مدح کی بنا پر ہوگا یا حال ہونے کی بنا پر اور جب اسے مرفوع پڑھیں تو اس کی دو صورتیں ہیں یا تو یہ تنوین کے ساتھ ہوگا یا بغیر تنوین کے دونوں صورتوں میں یہ مبتدائے محذوف کی خبر ہوگا۔

سوال نمبر ۳۶: مالک یوم الدین میں اسم فاعل کی جو ظرف کی طرف اضافت ہے اس حوالے سے ایک اعتراض وارد ہوتا ہے اعتراض و جواب دونوں واضح طور پر بیان کریں؟

جواب: اعتراض: مالک یوم الدین میں مالک نکرہ ہے اضافت لفظیہ ہونے کی وجہ سے (اضافت لفظیہ یہ ہوتی ہے کہ مضاف ایسا صیغہ صفت ہو جو اپنے معمول کی طرف مضاف ہو) لہذا یہ معرفہ (اللہ) کی صفت کس طرح ہو سکتا ہے۔

جواب: اس سے پہلے تمہید وہ یہ کہ اسم فاعل و مفعول کے عمل کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ حال یا استقبال کے معنی میں ہو ورنہ وہ عمل نہیں کریں گے تمہید کے بعد جواب یہ ہوگا کہ یہاں مالک حال و استقبال کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ماضی کے معنی میں ہے یا استمرار کے معنی میں تو جب یہ حال و استقبال کے معنی میں نہیں تو یہ اپنے معمول کی طرف مضاف بھی نہیں ہوگا اس صورت میں یہ اضافت حقیقیہ (معنویہ) بن جائے گی جو کہ تعریف کا فائدہ دیتی ہے لہذا معرفہ کی صفت واقع ہو سکتا ہے۔

سوال نمبر ۳۷: لفظ دین سے تین معانی مراد لیے گئے ہیں جزاء، شریعت اور اطاعت آپ سے سوال یہ ہے کہ یوم کی اضافت شریعت اور اطاعت کی طرف مفہوم اور معنی کے اعتبار

سے کیسے صحیح ہوگی؟

جواب: یوم کے بعد اور الدین سے پہلے لفظ جزاء مقدر ہوگا اب مفہوم و معنی کے اعتبار سے اضافت درست ہو جائے گی۔

سوال نمبر ۳۸: اللہ تعالیٰ پر ان اوصاف کا اجراء کس بات پر دلالت کیے لیے کیا گیا ہے۔ تفصیل سے ذکر کریں اور یہ بتائیں کہ فان ترتب الحکم علی الوصف یشعر بعلیة له میں کس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

جواب: اللہ عزوجل پر ان اوصاف کا اجراء اس بات پر دلالت کرانے کے لیے کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حمد کا مستحق ہے کوئی بھی اس کے سوا اس سے زیادہ حقدار نہیں ہے۔ بلکہ حقیقۃ اس کے سوا حمد کا کوئی بھی مستحق نہیں ہے۔ فان ترتب الحکم الخ سے اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا۔ کیونکہ حمد کا حکم مترتب ہے اوصاف مذکورہ پر جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حمد کا ان اوصاف کی وجہ سے مستحق ہے اور چونکہ یہ اوصاف اس کے غیر میں پائے نہیں جاتے اس لیے حمد کا وہی مستحق ہے۔

سوال نمبر ۳۹: اللہ تعالیٰ کے جن چار اوصاف کا ذکر ہوا ان کی وضاحت مطلوب ہے نیز لیس یصدر منه لایجاب بالذات او وجوب علیه قضیة بسوابق الاعمال اس عبارت میں دو جماعتوں کا رد کیا گیا ہے اس کی وضاحت کیجئے؟

جواب: وصف اول اس بات کو واضح کرنے والا ہے کا موجب حمد کیا ہے اور وہ ایجاد و تربیت ہے جو رب العالمین سے سمجھا جا رہا ہے۔ دوسرا اور تیسرا (الرحمن الرحیم) اس بات پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ اس (رحمن ورحیم) کی وجہ سے فضیلت حاصل کرنے والا اسمیں اختیار بھی رکھتا ہے۔ اور یہ اس سے ذات کے اعتبار سے واجب ہونے سے بھی صادر نہیں ہوتا اور نہ یہ اس پر اعمال سابقہ پر جزاء کے اعتبار سے واجب ہے۔ چوتھا وصف

(مــالـک الیـوم الدین) اختصاص کی تحقیق کے لیے ہے کیونکہ یہ ملک میں شرکت کو قبول نہیں کرتا۔

فلاسفہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل موجب بالذات ہے اس سے جو بھی شی صادر ہوتی ہے وہ ایجاب واضطرار کے طور پر ہوتی ہے تو علامہ بیضاوی نے لیــس یـصـدر الخ سے انکار ذکر دیا۔ اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر نیک بندے کو اس کے اعمال سابقہ کی وجہ سے ثواب اور گنہگار کو اس کے گزرے ہوئے اعمال کی وجہ سے سزا دینا واجب ہے تو علامہ بیضاوی نے او وجب علیہ الخ سے انکار ذکر فرمایا۔

سوال نمبر ۴۰: مـالـک یوم الدین تک غیبت کا طریقہ اختیار کیا گیا جب کہ ایاک نعبد وایـاک نستعین میں خطاب کا انداز اپنایا گیا اس کے حوالے سے امام بیضاوی کی تقریر آسان پیرائے میں ذکر کریں اور انہوں نے اہل عرب سے جو استشہاد کیا ہے وہ بھی ذکر کریں؟

جواب: تقریر: پہلے اللہ عزوجل کے حمد کے لائق ہونے کو بیان کیا گیا پھر اس کے بعد عظمت والی صفات کو ذکر کیا گیا جن سے اللہ تعالیٰ کی ذات باقی تمام ذاتوں سے ممتاز ہوگئی تو اس سے ایک معین معلوم حاصل ہوگیا۔ پھر اسکے بعد خطاب کا صیغہ لایا گیا ایک تو اس لیے تا کہ یہ اختصاص پر زیادہ دلالت کرے۔ (کیونکہ اگر غائب کی ضمیر ایاہ لائی جاتی تو اس سے اتنا اختصاص ظاہر نہ ہوتا) لیکن جب غیب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا تو اس نے اختصاص کے معنی کو پکا کر دیا۔ اور دوسری یہ وجہ ہے کہ پہلے غیب کے صیغے استعمال کیے گئے تو اس سے برھان حاصل ہوگئی۔ پھر خطاب کی طرف التفات کیا گیا تا کہ اس برھان سے عیان کی طرف ترقی ہو جائے۔ اور غیب سے شہود کی طرف انتقال ہو جائے۔ گویا کہ معلوم ہوگیا' معقول مشاہد ہوگیا اور غیب حاضر ہوگیا۔ عارف کے حال (ذکر' فکر اور اس کے اسماء

میں تامل) کے مناسب پہلا کلام ہے پھر اس کے بعد اس کے معاملے کی انتہاء (کہ وہ اہل مشاہدہ میں سے ہو) لائی گئی۔

پہلے کلام کی بنیاد عارف کے ابتدائی حال (ذکر فکر اور اس کے اسماء میں تامل) پر رکھی گئی اور کلام کے دوسرے حصے کی بنیاد عارف کے معاملہ کے منتہی پر رکھی جو کہ اھل مشاہدہ میں سے ہونا اور وصول کی گہرائی میں غوطہ زن ہونا ہے تا کہ وہ اسے سامنے دیکھ لے۔

استشہاد اھل عرب کے کلام سے

تطاول لیلک بالا ثمد　　ونام الخلی ولم ترقد

وبات وباتت له لیلۃ　　کلیلۃ ذی العائر الارمد

وذلک من بناء جاء نی　　وخبرته عن ابی الاسود

مذکورہ بیت تین التفاتات پر مشتمل ہے پہلا لیلک میں کیونکہ یہ تکلم سے خطاب کی طرف التفات ہے کیونکہ قیاس لیلی چاہتا ہے اور دوسرا التفات بات میں ہے جو کہ خطاب سے غیب کی طرف التفات ہے کیونکہ قیاس بِتُّ کو چاہتا ہے۔ اور تیسرا جاء نی میں ہے جو کہ غیب سے تکلم کی طرف ہے کیونکہ قیاس جاء ہ کہ تقاضا کرتا ہے۔

سوال نمبر ۱۴: ایاک میں ایا ضمیر ہے یا ک اس سلسلے میں مختلف اقوال ذکر کریں؟

جواب: ایاک میں **ایا** ضمیر منفصل ہے اور اس کے ساتھ جو ی یا کاف یا ھا ملائی جاتی ہے وہ حروف زائدہ ہیں جو خطاب، غیب اور تکلم کے بیان کے لیے آتے ہیں۔

اور امام خلیل کا قول یہ ہے کہ ایا مضاف ہے ان (ک، ی، ہ) کی طرف۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ (ک، ہ، ی) ضمائر ہیں اور ایا عمدہ ہے کیونکہ جب یہ ضمائر عوامل سے جدا رہ گئیں تو ان سے نطق متعذر ہو گیا اس حال میں کہ یہ مفردہ ہیں اس لیے ان کے ساتھ ایا ملا دیا گیا تا کہ یہ ضمائر اس ایا کے ساتھ مستقل ہو جائیں۔

سوال نمبر ۴۲: عبادت اور استعانت کا مفہوم واضح کریں اور یہ بتائیں کہ معونت کی کتنی اور کون کونسی اقسام ہیں اور صحت تکلیف کس معونت پر موقوف ہے نیز اس آیت میں کس کام پر مدد طلب کی جارہی ہے؟

جواب: عبادت' خضوع اور تذلل کی غایت کی انتہاء کو کہتے ہیں اس سے طریق معبد (مذلل) ہے اور ثوب ذو عبدۃ ہے جب کہ کپڑا انتہائی موٹا ہو۔ اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خضوع میں استعمال ہوتا ہے۔

اور استعانت' طلب معونت کو کہتے ہیں اور معونت یا تو ضروریہ ہوگی یا غیر ضروریہ' اور معونتِ ضروریہ وہ ہے جس کے بغیر فعل ادا ہی نہ ہو جیسے فاعل کو قدرت دینا اور فاعل کو اس کا تصور ہونا نیز آلہ اور مادہ کا ہونا جس کے ذریعے' فاعل فعل ادا کرے' جب یہ معونات جمع ہو جائیں تو انسان استطاعت کے ساتھ موصوف ہوتا ہے اور صحتِ تکلیف بھی اسی معونت پر موقوف ہے اور غیر ضروریہ وہ معونت ہے جس کے ذریعے فعل آسان ہو جائے' جس طرح کہ اس آدمی کے لیے سواری مہیا ہو جانا جو پیدل چلنے پر قادر ہو۔

اس آیت میں طلب معونت یا تو جمیع امور پر کی جارہی ہے یا عبادت کی ادائیگی میں۔

سوال نمبر ۴۳: سورۃ فاتحہ پڑھنے والا شخص تنہا ہوتا ہے جمع کی ضمیر لانے کی کیا وجہ ہے اور مفعول کو مقدم کرنے کے حوالے سے امام بیضاوی رحمہ اللہ کی تقریر ذکر کریں؟

جواب: جمع کی ضمیر اس لیے لائے تا کہ اس میں قاری کے ساتھ ساتھ محافظ فرشتے اور حاضرین جماعت یا تمام موحدین کی عبادتوں کا ذکر ہو جائے اور قاری کی حاجت ان تمام کی حاجتوں کے ساتھ مل جائے اور اس کی برکت سے اس قاری کی عبادت قبول ہو جائے اور حاجت پوری ہو جائے۔

ایــــاک مفعول کو عامل پر مقدم کیا گیا اس کی عظمت کی بنا پر اور اس کے اہم ہونے وجہ سے نیز حصر پر دلالت کرنے کے لیے (کیونکہ قاعدہ ہے کہ تـقـديـم مـاحـقـه التـاخيـر يـفيـد الحصر و التخصيص) اور اس کو مقدم کرنے کے لیے (ذکر میں) جو وجود میں بھی مقدم ہے اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لیے کہ عابد کے لیے مناسب یہ ہے کہ اس کی نظر پہلے اور بالذات معبود پر ہو پھر اس سے عبادت کی طرف وہ بھی اس حیثیت سے نہیں کہ عبادت اس سے صادر ہو رہی ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ یہ نسبتِ شریفہ ہے باری تعالیٰ کی طرف اور اس کے اور حق تعالیٰ کے درمیان وسیلہ ہے کیونکہ عارف کا وصل تب متحقق ہوتا ہے جب وہ اس وصل میں جنابِ قدس کے ملاحظہ میں مستغرق ہو جائے اسی وجہ سے ان اللّٰہ معنا کو معی ربی پر فضیلت حاصل ہے۔

سوال نمبر ۴۴: عبادت کو استعانت پر کیوں مقدم کیا گیا اس کی وجہ بیان کریں اور نـعـبـد کے نون پر فتحہ کے علاوہ کوئی اور حرکت پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: عبادت کو استعانت پر اس لیے مقدم کیا گیا تا کہ آیتوں کے اواخر موافق ہو جائیں نیز اس سے یہ معلوم ہو جائے کہ وسیلہ کو طلبِ حاجت پر مقدم کرنا اجابت کے زیادہ قریب کرنے والا ہے۔

نعبد پر فتحہ کے علاوہ کسرہ بھی پڑھ سکتے ہیں (یہ بنی تمیم) کی لغت کے مطابق ہے کیونکہ وہ حروفِ مضارع کو سوائے یا کے کسرہ دیتے ہیں جب کہ ان کا مابعد مضموم نہ ہو۔

سوال نمبر ۴۵: اهدنا الصراط المستقيم کی کیا حیثیت ہے نیز ہدایت کسے کہتے ہیں اور فاهدوهم الی صراط الجحيم کے حوالے سے سوال و جواب کی وضاحت کریں؟

جواب: یہ اهـدنـا الـصـراط الخ اس معونت کا بیان ہے جس کو طلب کیا گیا گویا کہ فرمایا میں تمہاری کیا مدد کروں تو عرض کیا اهدنا الایۃ۔ اور چونکہ یہ ہدایت سب سے بڑا مقصود ہے

اس لیے اس کو الگ لایا گیا۔ اور ہدایت کہتے ہیں لطف کے ساتھ راہنمائی کرنے کو (اسی وجہ سے یہ خیر میں استعمال ہوتی ہے)

اعتراض: آپ نے یہ کہا کہ ہدایت لطف کے ساتھ راہنمائی کو کہتے ہیں حالانکہ اللہ عزوجل کا ارشاد فاھدوھم الیٰ صراط الجحیم (کہ ان کو صراط جحیم کی طرف ہدایت دو) ہے حالانکہ صراط جحیم کی طرف راہنمائی لطف کے ساتھ نہیں ہے۔

جواب: یہ ارشاد تحکم (ڈانٹ ڈپٹ) کے طور پر ہے

سوال نمبر ۴۶: مصنف علیہ الرحمۃ نے ہدایت کی چار صورتیں بیان کی ہیں ان پر روشنی ڈالیں نیز فالمطلوب اما زیادۃ الخ سے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اعتراض اور جواب دونوں کی وضاحت کیجئے؟

جواب: ہدایت کی چار صورتیں

(۱) وہ قوتیں عطا کرنا جن سے انسان اپنے مصالح کی طرف اھتداء پر قادر ہو جاتا ہے۔ (جس طرح قوت عقلیہ، حواس باطنہ اور ظاہری مشاعر (حواس)

(۲) ایسے دلائل قائم کر دینا جو حق و باطل اور صلاح و فساد کے مابین فرق کر دیں (والیہ اشار حیث قال وھدینہ النجدین وقال فھدینھم فاستحبوا العمی علی الھدی)

(۳) رسولوں کے بھیجنے اور کتابیں اتارنے کے ساتھ ہدایت دینا (وایاھا عنی بقولہ وجعلناھم ائمۃ الایۃ وقولہ ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم)

(۴) لوگوں کے دلوں پر راز ظاہر کر دینا اور ان کو اشیاء دکھا دینا جیسے در حقیقت ہیں وحی، الہام یا سچی خوابوں کے ذریعے۔

فالمطلوب الخ

اعتراض:(اگر صراط مستقیم سے طریقِ حق اور ملتِ اسلام مراد ہو تو پھر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ ان بندوں کی زبانوں پر اتاری جنہوں نے اس کو حمد کے ساتھ خاص کیا اور اس کی شان کے لائق صفات بیان کیں پھر ان کی طرف سے طلبِ ہدایت کیسے درست ہے حالانکہ وہ پہلے ہی ہدایت پر ہیں تو یہ تحصیلِ حاصل ہے جو کہ باطل ہے۔

جواب: اهدنا سے جو ہدایت طلب کی جارہی ہے اس سے مقصود یا تو زیادتی ہدایت ہے یا ہدایت پر ثابت قدمی ہے یا ان مراتب کا حصول ہے جو ہدایت پر مرتب ہوتے ہیں۔(یہی وجہ ہے کہ جب عارف باللہ یہ کہے گا تو اس مراد یہ لے گا اے اللہ تو مجھے ہدایت (راہ دکھلا) دے اپنی طرف چلنے کے راستہ کی تاکہ تو ہم سے ہمارے احوال کی ظلمتوں کو مٹادے اور ہمارے بدنوں کے پردوں کو زائل فرمادے تاکہ تیرے نورِ قدس سے روشنی حاصل کر کے تجھے تیرے نور سے دیکھ لیں۔

سوال نمبر ۴۷: امر اور دعا کی باہم مشارکت اور تفاوت کی کیا صورت ہے نیز صراط اصل میں سین کے ساتھ ہے اس اعتبار سے صراط کو سراط کیوں کہتے ہیں۔اور سین کو صاد سے بدلنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: امر اور دعا کا لفظاً اشتراک تو بالکل ظاہر ہے(کیونکہ دونوں کے لیے ایک ہی صیغہ مستعمل ہے) اور معناً بھی کبھی یہ دونوں باہم شریک ہو جاتے ہیں کیونکہ دونوں طلب فعل کے لیے آتے ہیں۔لیکن یہ استعلاء اور سفل کے ساتھ متفارق ہو جاتے ہیں کیونکہ جب متکلم اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر یہ صیغہ استعمال کرے گا تو یہ امر کہلائے گا ورنہ دعا۔

صراط کو سراط (اصل کے اعتبار سے) اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ سرط الطعام سے ماخوذ ہے جس کا معنی یہ ہے کہ اس نے طعام کو نگلا یا چبایا تو چونکہ قافلہ راستے

کونگل جاتا ہے یعنی طے کرتا ہے اس لیے اسے صراط کہتے ہیں۔ یا وہ راستہ قافلے کو نگل جاتا ہے اس لیے اسے صراط کہتے ہیں

سین کو صاد سے اس لیے بدلا گیا تاکہ یہ صفت اطباق میں طاء کے مطابق ہو جائے۔

سوال نمبر ۴۸: لفظ صراط کو مختلف طریقوں سے پڑھا جاتا ہے ان صورتوں کی وضاحت کریں اور بتائیں کہ صراطِ مستقیم سے کیا مراد ہے؟

جواب: لفظ صراط کو سراط' صراط' اور صاد کو زاء کو بو دے کر پڑھا جاتا ہے صراط مستقیم سے مراد طریق حق ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ملتِ اسلام ہے۔

سوال نمبر ۴۹: صراط الذین انعمت علیهم ترکیب میں کیا واقع ہوتا ہے اور اس کے لانے کی حکمت کیا ہے اور یہ بھی بتائیں کہ مصنف کے قول وھو فی حکم تکریر العامل من حیث انه المقصود بالنسبة میں کس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

جواب: یہ پہلے صراط الذین سے بدل واقع ہے (بدل کل) اور اسے لانے میں حکمت یہ ہے کہ اس سے تاکید اور تنصیص ہوگئی اس بات پر کہ مسلمانوں کا راستہ ہی وہ راستہ ہے جس کے مستقیم ہونے کی گواہی دی گئی ہے اور مصنف کے قول وھو فی حکم الخ سے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بدل چونکہ نسبت سے مقصود ہوتا ہے اس لیے بدل کے ذکر کے وقت نسبت بھی ملحوظ ہوگی اور نسبت کا تکرار عامل کے تکرار سے ہوتا ہے لہذا بدل سے پہلے حکماً عامل متکرر ہوگا۔

سوال نمبر ۵۰: منعم علیهم سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: اس کے بارے چند اقوال ہیں۔

(۱) اس سے انبیاء کرام علیہم السلام مراد ہیں۔

(۲) اصحاب موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام مراد ہیں لیکن تحریف وتنسیخ سے پہلے لیکن قرآن حکیم کی دوسری آیت میں اس بات کی تصریح ہے کہ اس سے انبیاء کرام علیہم السلام صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ مراد ہیں۔

سوال نمبر ۵۱: انعام کا کیا معنی ہے اور مصنف علیہ الرحمۃ نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جس تقسیم کے ساتھ ذکر کیا ہے اس تقسیم کی وضاحت کیجئے اور یہاں کونسی قسم مراد ہے؟

جواب: انعام کا معنی ایصال النعمة (نعمت پہنچانا) ہے (ویسے تو انعام اس حالت کو کہتے ہیں جس سے انسان لذت حاصل کرتا ہے پھر اس کا اطلاق اس نعمت پر کر دیا گیا جس سے انسان لذت حاصل کرتا ہے اور وہ لین ہے)

تقسیم نعمت: اللہ عزوجل کی نعمتیں دو جنسوں میں منحصر ہیں دنیوی، اخروی دنیوی کی پھر دو قسمیں ہیں موھبی، کسبی، موھبی کی پھر دو قسمیں ہیں (۱) روحانی (جیسے انسان میں روح پھونکنا اور اس کو عقل کے ساتھ روشن کرنا اور اس کی تابع قوتیں جیسے فہم، فکر، نطق وغیرہ)

(۲) جسمانی (جیسے تخلیق بدن اور وہ قوتیں جو بدن میں حلول کیے ہوئے ہیں اور کمالِ اعضاء، صحت وغیرہ)

اور کسبی نعمتیں (نفس کو رذائل سے پاک کرنا اور عمدہ اخلاق سے مزین کرنا، حصولِ جاہ وغیرہ) ہیں اور اخروی وہ نعمتیں ہیں کہ جس میں انسان کی کوتاہیوں کی مغفرت اور اس سے راضی ہونا اور اعلیٰ علیین میں اس کو ملائکہ مقربین کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ ٹھکانا دینا۔ (لیکن یہاں آیت میں اخروی نعمتیں اور جو ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں وہ مراد ہیں کیونکہ اس کے علاوہ میں مومن وکافر دونوں شریک ہیں۔

سوال نمبر۵۲: غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ترکیب میں کیا واقع ہوتا ہے اور وذلك انما یصح باحد تاویلین اس عبارت سے کیا بتانا مقصود ہے اس کی وضاحت کریں؟

جواب: غیر المغضوب الخ: یہ الذین الخ سے بدل واقع ہے یا یہ الذین کی صفت واقعہ ہوگا (مبینہ یا مقیدہ صفت مبینہ تو موصوف کے اجمال و ابہام کو دور کر دیتی ہے اور صفت مقیدہ موصوف کو مقید کر دیتی ہے پہلی تب ہوگی جب ایمان سے مراد ایمان کامل ہو اور دوسری تب ہوگی جب ایمان سے فقط تصدیق مراد ہو اب چونکہ مصدق کبھی مغضوب علیہ بھی ہوتا ہے تو غیر المغضوب علیھم الخ نے ان حضرات کو موصوف سے خارج کر کے اس کو مقید کر دیا)

وذالك: الخ غیر الخ کو صفت ماننے کی صورت میں اشکال لازم آئے گا کہ الذین معرفہ ہے اور غیر نکرہ تو ان دونوں میں موافقت نہیں ہے تو علامہ بیضاوی نے وذلك الخ سے جواب دیا کہ غیر الخ کو صفت ماننا دو تاویلوں میں سے ایک کو تسلیم کرنے کے ساتھ درست ہوگا۔

(۱) موصول کو نکرہ کے قائم مقام کر دیا جائے۔

(۲) غیر کو اضافت کی وجہ سے معرفہ قرار دیا جائے کیونکہ غیر اسکی طرف مضاف ہے جس کی ایک ہی ضد ہے لہذا وہ متعین ہوگیا۔

سوال نمبر۵۳: ابن کثیر نے لفظ غیر کو منصوب پڑھا ہے تو ان کے نزدیک اس کا نصب کس بنیاد پر ہوگا اور یہ بھی بتائیں کہ لفظ غضب کا لغوی معنی کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کیسے صحیح قرار پائے گی؟

جواب: ابن کثیر نے اسے ضمیر مجرور (علیھم) سے حال واقع ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا

ہے اور عامل انعمت کو مانا ہے۔ یا یہ اعنی کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا یا مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے (یہ تب ہے جب کہ نعمتیں کافروں اور مومنوں دونوں کو شامل مانی جائیں)

غضب کا لغوی معنی ثوران النفس عند ارادۃ الانتقام (نفس کا ہیجان انتقام کے ارادہ کے وقت) ہے اللہ تعالیٰ کی طرف جب اس کی نسبت کی جائے گی تو اس سے منتہیٰ وانجام (عذاب دینا) مراد ہوگا۔

سوال نمبر۵۴: لفظ علیھم ایک جگہ محل رفع میں ہے اور دوسری جگہ محلِ نصب میں ہے دونوں صورتوں کی وضاحت کریں اور لفظ لا کے بارے میں مصنف نے کیا فرمایا اور اس پر کچھ مثالیں پیش کی ہیں ان کی وضاحت کریں؟

جواب: علیھم جو المغضوب کے بعد ہے وہ محلِ رفع میں ہے کیونکہ المغضوب کا یہ نائب فاعل ہے اور علیھم جو انعمت کے بعد ہے وہ محلِ نصب میں ہے کیونکہ وہ مفعول بہ ہے۔

اور لا 'غیر میں پائے جانے والے نفی کے معنی کی تاکید کے لیے مزیدۃ ہے گویا کہ فرمایا گیا لا المغضوب علیھم ولا الضالین ۔ اور چونکہ غیر میں نفی کا معنی پایا جاتا ہے تو یہ لا کے معنی میں ہوا اسی وجہ سے انا زیدا غیر ضارب درست ہے کیونکہ غیر مضاف نہیں بلکہ لا کے معنی میں ہے لہٰذا یہاں تقدیمِ مفعول علی عامل مضاف الیہ لازم نہیں آتی یہ ایسے ہی ہے جیسے انا زیدا لا ضارب جائز ہے اور انا زیدا مثل ضارب جائز نہیں کیونکہ مثل مضاف عامل ہے اور یہ زیدا جو کہ ضارب کا مفعول ہے اس کا ضارب کے عامل پر مقدم ہونا لازم آتا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

سوال نمبر۵۵: ضلال سے کیا مراد ہے اور المغضوب علیھم والضالین سے کون لوگ مراد ہیں تفصیل سے ذکر کریں اور اس پر قرآن مجید سے دلیل پیش کریں؟

جواب: ضلال سے مراد العدول عن الطریق عمدا او خطا (سیدھے راستے سے جان بوجھ کر یا غلطی سے ہٹنا) ہے ایک قول کے مطابق المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا من لعنه الله وغضب علیه اور الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں لقولہ تعالیٰ قد ضلوا من قبل واضلوا کثیرا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ المغضوب علیھم سے عصاۃ اور الضالین سے الجاھلون باللہ مراد ہیں کیونکہ منعم علیہ وہ ہے جو معرفۃ حق لذاتہ اور معرفۃ خیر للعمل بہ کا جامع ہو تو اس کا مقابل وہی ہوگا جس نے ان دونوں میں سے ایک میں خلل ڈالا لہذا مخل بالعمل فاسق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان جان بوجھ کر قتل کرنے والے کے بارے میں وغضب الله علیه اور مخل بالعلم جاھل ضال ہے لقوله تعالیٰ فماذا بعد الحق الا الضلال۔

سوال نمبر ۵٦: ولا الضالین میں کن لوگوں کے نزدیک ہمزہ پڑھا جاتا ہے اور اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: وہ حضرات جو التقائے ساکنین سے بھاگنے میں بہت کوشش کرتے ہیں ان کی لغت کے مطابق ولا الضألین ہمزہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے کیونکہ اس طرح التقائے ساکنین لازم نہیں آتا۔

سوال نمبر ۵۷: لفظ آمین نحوی اعتبار سے کیا ہے اور یہ مد اور قصر دونوں طرح آتا ہے اس پر عربی کلام سے کوئی دلیل ذکر کریں؟

جواب: لفظ آمین اس فعل کا اسم ہے جو کہ استجب ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا معنیٰ پوچھا تو آپ نے فرمایا افعل۔ اور یہ مبنی بر فتحہ ہے این کی طرح التقائے ساکین کی وجہ سے اور لفظ آمین مد اور قصر دونوں طرح آیا ہے جیسے شاعر کا قول ویرحم الله عبدا قال آمینا اور مد سے مراد الف

کی مداور قصر (بغیر مد کے) ہے وقال امین فزاد اللّٰہ ما بیننا بعد۔

سوال نمبر ۵۸: لفظ آمین قرآن مجید کا حصہ ہے یا نہیں اور سورۂ فاتحہ کے آخر میں اس کا پڑھنا کیا حیثیت رکھتا ہے نیز امام لفظ آمین پڑھے یا نہیں اس سلسلے میں مصنف کا موقف کیا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک کیا ہے؟

جواب: لفظ آمین قرآن مجید کا حصہ بالاتفاق نہیں ہے سورۂ فاتحہ کے آخر میں اسے پڑھنا مسنون ہے، مصنف کے نزدیک امام اسے کہے گا اور کہے گا بھی بلند آواز سے (جہری نمازوں میں) امام صاحب رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ امام اسے نہیں کہے گا لیکن آپ سے مشہور یہ ہے کہ امام اسے آہستہ کہے گا۔

سوال نمبر ۵۹: سورۂ فاتحہ کی فضیلت کے بارے میں صاحب تفسیر نے کچھ روایات نقل کی ہیں ان کی روشنی میں اس سورت کی فضیلت بیان کریں؟

جواب: سورۂ فاتحہ کی احادیث میں بہت فضیلت وارد ہوئی ہے جن میں سے چند پیش خدمت ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ میں تمہیں ایسی سورۃ کی خبر نہ دوں جس کی مثل توراۃ وانجیل اور قرآن حکیم میں (یعنی قرآن حکیم میں دوسرے مقام پر) نازل نہیں ہوئی تو حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کیوں نہیں یارسول اللہ (ﷺ) تو آپ نے فرمایا فاتحۃ الکتاب یہ سبع مثانی اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھے کہ آپ کے پاس ایک فرشتہ آیا اور عرض کی آپ کو دو نوروں کی خوشخبری ہو جو آپ کو عطا کیے گئے اور آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کیے گئے۔ وہ فاتحۃ الکتاب اور سورۃ

بقرہ کی آخری آیات ہیں۔ آپ اس میں سے جو بھی حرف تلاوت فرمائیں اس کے بدلے میں آپ کو عطا کیا جائے گا۔

اور حضرت حذیفہ الیمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ عزوجل کسی قوم پر حتمی طور پر عذاب بھیجنے والا ہوتا ہے کہ اس قوم کے بچوں میں سے کوئی بچہ مکتب میں الحمد للہ رب العالمین پڑھتا ہے اللہ تعالی اسے سن کر ان سے چالیس سال تک عذاب دور فرمادیتا ہے۔

﴿سورۃ بقرۃ﴾

سوال نمبر ۶۰: حروف مقطعات کو اسماء قرار دیا گیا اسماء ہونے پر کیا دلیل ہے نیز ان کے مسمیات کیا ہیں؟

جواب: ان کے مسمیات وہ حروف ہیں جن سے کلمات مرکب ہوتے ہیں جیسے الف' با' تا' وغیرہ۔

ان کے اسماء ہونے کی دلیل:

(۱) ان پر اسم کی تعریف صادق آتی ہے۔

(۲) ان پر اسم کے خواص (تعریف' تنکیر' جمع' تصغیر وغیرہ) آتے رہتے ہیں۔ نیز ان کے اسماء ہونے کی امام خلیل ابوعلی نے بھی تصریح کی ہے۔

سوال نمبر ۶۱: ومارویٰ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ولعلہ سنماہ باسم مدلولہ تک عبارت میں ایک اعتراض کا جواب ہے اعتراض اور جواب دونوں کی وضاحت کیجئے؟

جواب: اعتراض:

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے (جس کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا

ہے) جس نے کتاب اللہ سے ایک حرف پڑھا اس کے لیے ایک نیکی ہے اور حسنہ اپنی دس مثلوں کے ساتھ ہے میں نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے تو اس حدیث میں الم کو حروف کہا گیا ہے جب کہ آپ اسے اسماء قرار دے رہے ہیں۔

جواب: حدیث مذکورہ میں حرف سے حرف اصطلاحی مراد نہیں کیونکہ حرف کا اصطلاح کے ساتھ خاص ہونا عرف جدید ہے بلکہ وہاں حدیث میں حرف سے لغوی معنی مراد ہے۔

ولعلہ سے دوسرا جواب ہے کہ ہوسکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو حروف ان کے مدلولات کے اسماء کے اعتبار سے قرار دیا ہو۔ حالانکہ ان کے مدلولات کو ہم بھی حروف مانتے ہیں۔

سوال نمبر ۶۲: مصنف نے ان اسماء مسمیات سے سورت کے آغاز کی کیا وجہ بیان کی ہے۔ نیز الف کی جگہ ہمزہ لانے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: چونکہ ان اسماء کے مسمیات ایک ایک حرف ہیں اور یہ اسماء خود مرکب ہیں لہذا ان اسماء کا آغاز ان کے مسمیات سے کیا گیا تا کہ ان اسماء کی ادائیگی مسمیات کے ساتھ سب سے پہلے کانوں میں پڑے اور الف کی جگہ ہمزہ اس لیے لایا گیا کہ الف ساکن ہوتا ہے اور ساکن سے ابتداء متعذر ہوتی ہے۔

سوال نمبر ۶۳: مفسر علیہ الرحمۃ نے اسماء کے معرب ہونے کے حوالے سے کیا مسلک اختیار کیا ہے اور اس پر کیا دلیل دی ہے؟

جواب: جب تک ان (اسماء) کے ساتھ عوامل نہ ملیں یہ ساکن اعراب سے خالی ہوتے ہیں اس لیے کہ اعراب کا موجب اور مقتضی نہیں پایا گیا لیکن یہ اعراب کے قابل ہوتے ہیں کیونکہ یہ مبنی الاصل کے مشابہ نہیں اس لیے ان پر اعراب آسکتا ہے اور ان کے مبنی الاصل

کے مشابہ نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مِن ق کو اجتماع ساکنین کے باوجود پڑھا جاتا ہے اور این اور ھؤلاء (ان میں دوسرے ساکن کو حرکت دی گئی) والا معاملہ نہیں کیا گیا۔

سوال نمبر ۶۴: حروف مقطعات کو بعض سورتوں کے شروع میں لانے کی گیارہ وجوہ بیان کی گئی ہیں ان کا اجمالی ذکر کریں؟

جواب: (۱) جس کو قرآن حکیم کے ذریعے چیلنج کیا گیا ہے اس کو بیدار کرنے کے لیے۔

(۲) اور اس بات پر تنبیہ کرنے کے لیے کہ متلو علیہم کلام منظوم ہے اس سے جس سے اہل عرب اپنے کلام کو منظوم کرتے ہیں تو اب اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ تمام اس کے قریب قریب کلام لانے سے عاجز نہ آتے۔

(۳) تاکہ کانوں میں سب سے پہلے پڑنے والی شی اعجاز کی نوع کے ساتھ متصل ہو کیونکہ اسماء حروف کے ساتھ نطق ان کے ساتھ خاص ہے جو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں لیکن وہ امی جو کاتبوں سے نہیں ملے تو اس سے نطق بعید، غریب خارقِ عادت ہے۔

(۴) یہ حروف زائد کیے گئے ہیں تنبیہ کے لیے اور انقطاع کلام پر دلالت کے لیے نیز دوسرے کلام کے مستانف ہونے پر دلیل کے لیے۔

(۵) اس سے ان کلمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے یہ مختصر کیے گئے ہیں

(۶) ان سے اشارہ قوموں کی مدتوں کی طرف جملوں کے حساب سے ہے۔

(۷) ان سے حروفِ مبسوط پر دلالت کرائی گئی ہے ان سے قسم کھاتے ہوئے۔

(۸) یہ اسماء قرآن ہیں۔

(۹) یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں۔

(۱۰) الف اقصی حلق سے ہے اور مخارج کا مبدأ ہے اور لام طرف لسان سے ہے اور

یہ وسطِ مخارج ہے۔ اور میم شفت سے ہے اور یہ آخرِ مخارج ہے ان کو اس لیے جمع کر دیا گیا کہ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہو گیا کہ بندے کے لیے مناسب یہ ہے کہ اس کا اول کلام اوسطِ کلام اور آخر کلام اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو۔

(۱۱) یہ راز ہیں جن کو اللہ عزوجل نے اپنے علم کے ساتھ خاص فرمایا۔

سوال نمبر ۶۵: پہلی دو وجہیں جن کو مصنف نے زیادہ پسند کیا ہے ان کی تفصیل لکھیں؟

جواب: پہلی دو وجہیں جن کو مصنف نے پسند کیا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) سورتوں کا ان سے آغاز کیا گیا اس شخص کو بیدار کرتے ہوئے جسے قرآنِ کریم کے ساتھ چیلنج کیا گیا اور اس بات پر تنبیہ کرنے کے لیے کہ متلو علیہم ایسا کلام ہے جو منظوم ہے اس سے جس سے وہ اپنے کلام کو منظوم کرتے ہیں۔

(۲) کان میں سب سے پہلے پڑنے والی وہ شی ہو جو اعجاز کی ایک نوع کے ساتھ مستقل ہو۔

نوٹ: ان کی تفصیل سوال ۶۴ کے جواب کے ضمن میں کر دی گئی ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال نمبر ۶۶: وہ تمام حروف مقطعات جو بعض سورتوں کے شروع میں لائے گئے ہیں ان کی تعداد اور صفات کے حوالے سے مصنف نے ایک تعجب خیز بحث کی ہے ان کا خلاصہ نقل کریں؟

جواب: بعض سورتوں کے شروع میں ۱۴ حروف لائے گئے جو کہ حروفِ تہجی کے نصف ہیں (اگر الف کو مستقل حرف شمار نہ کیا جائے) اور یہ ۲۹ سورتوں کے شروع میں لائے گئے (حروف تہجی کی تعداد کے اعتبار سے) (جب کہ الف ان میں شمار کیا جائے) اور یہ حروف مقطعات حروف کی انواع کے نصفوں پر مشتمل ہے۔ پس حروف مہموسہ جو کہ دس ہیں ان میں سے نصف کو ذکر کیا گیا۔ اور باقی مجہورہ جن کی تعداد ۱۸ ہے میں سے نصف کو ذکر کیا گیا اور

حروف شدیدہ جو کہ ۸ ہیں میں سے نصف کو ذکر کیا ہے۔اور باقی رخوہ ہیں ان میں سے ۱۶ کا ذکر کیا گیا حروف مطبقہ (جو کہ ۴ ہیں) میں سے نصف کو ذکر کیے گئے اور باقی منفتحہ میں سے نصف کو ذکر کیا اور باقی حروف قلقلہ جو کہ پانچ ہیں میں سے نصف اقل کو ذکر کیا اور دو حروف لین میں سے ایک حرف یا ذکر کیا اور سات حروف مستعلیہ میں سے نصف اقل ذکر کیا اور باقی متخفضہ میں سے نصف ذکر کیے اور گیارہ حروف بدل ہیں ۶ مشہور (مجموعہ اطمین) ذکر گئے۔بعض نے سات اور بھی زائد کیے اب یہ ۱۸ ہو گئے تو ان میں سے ۹ حروف (۶ وہی مشہور اور تین ل،ص،ع ذکر کیے) اور وہ حروف جن کا اپنی مثل میں تو ادغام ہو جاتا ہے لیکن مقارب میں نہیں ہوتا اور وہ ۱۵ ہیں میں سے نصف اقل کو ذکر کیا اور جن کا مثل و مقارب دونوں میں ادغام ہوتا ہے اور وہ باقی تیرہ حروف ہیں ان میں سے نصف اکثر کو ذکر کیا۔اور وہ چار حروف جو مدغم نہیں ہوتے لیکن مدغم فیہ ہوتے ہیں ان میں سے نصف کو ذکر کیا اور چھ حروف ذلقیہ میں سے اور ۶ حروف حلقیہ میں سے یہ کل بارہ ہو گئے تو اس بارہ کے دوثلث (۸ حروف) ذکر کیے (کیونکہ یہ کثیر الاستعمال ہیں) مزید کی بناء ۷ حروف سے زائد نہیں ہوتی اس لیے حروف زوائد (جو کہ دس ہیں جن کا مجموعہ الیوم تنساہ ہے) میں سے ۷ حروف کو ذکر کیا۔اسی بات (کہ مزید کی بناء حروف سے زائد نہیں ہوتی) پر تنبیہ کرنے کے لیے۔

فائدہ: اگر کلمات اور ان کی تراکیب کی چھان بین کی جائے تو ہر جنس سے حروف متروکہ کم ہوں گے اور حروف مذکورہ زیادہ (یعنی کلام عرب میں) اسی طرح حروف مقطعات مفردہ ثنائیہ ثلاثیہ رباعیہ اور خماسیہ کرکے ذکر کیے گئے اس بات کی خبر دیتے ہوئے کہ متحدی بہ ان کے ان کلمات سے مرکب ہے جن کے اصول کلمات مفردہ و مرکبہ من الاثنین الی الخمسۃ ہیں۔

تین مفردات کو تین سورتوں کے شروع میں ذکر کیا گیا کیونکہ یہ کلمہ کے اقسام ثلثہ

اسم، فعل اور حرف میں پائے جاتے ہیں۔ اور چار ثنائیات کو ذکر کیا کیونکہ یہ حرف میں بلا حذف ہوتے ہیں جیسے بل اور فعل میں حذف کے ساتھ جیسے قل اور اسم میں بغیر حذف کے جیسے مَن اور حذف کے ساتھ جیسے دم اور یہ ۹ سورتوں میں ذکر کیے گئے کیونکہ ان میں سے ہرایک اقسام ثلثہ میں تین وجوں (فی اولہ ضم، کسر، فتح) پر آتے ہیں (اسماء میں اِذْ، ذو، مَن افعال میں قُل، بِع، خَف اور حروف میں اَنْ، مِنْ، مُذ) اور تین ثلاثیات کو ذکر کیا گیا کیونکہ اقسام ثلاثہ میں آتے ہیں اور یہ تیرہ سورتوں میں مذکور ہیں اس بات پر تنبیہ کرنے کے لیے کہ اصول ابنیہ مستعملہ ۱۳ ہیں دس اسماء کے لیے اور تین افعال کے لیے۔ دو رباعیوں اور دو خماسیوں کو ذکر کیا اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ ان میں سے ہرایک کی ایک اصل اور ایک ملحق ہے جیسے جعفر، سفر جل وقردد، حجنفل۔

سوال نمبر ۶۷: ان حروفِ مقطعات کو قرآنِ کریم کے شروع میں اکٹھا نہ لانے سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں ان کی وضاحت کریں؟

جواب: ایک تو وہی فائدہ ہے جو سوال ۶۶ کے جواب میں مفصل بیان ہوا اور دوسری بات یہ ہے کہ اس تفریق حروف میں اعادۂ تعریف تکریر تنبیہ اور تنبیہ میں مبالغہ ہے۔

سوال نمبر ۶۸: اگر ان اسماء کو سورتوں کے اسماء قرار دیا جائے تو اس کی کیا وجہ ہوگی اس حوالے سے مصنف نے جو بحث کی ہے اختصار کے ساتھ بیان کریں؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ حروف ایسے کلمات ہیں جن کی ترکیب معروف ہے تو اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتے تو ان کی طاقت اس کے معارضہ سے ساقط نہ ہوتی ان حروف کے سورتوں کے اسماء ہونے پر استدلال اس طرح کیا گیا ہے کہ یہ حروف مفہمہ ہوں گے یا نہیں دوسری صورت باطل ہے کیونکہ اگر ان کی سمجھ نہ ہو تو ان سے خطاب ایسے ہوگا جیسے مہمل کے ساتھ خطاب اور پہلی صورت ہو تو یا تو ان سے

وہ سورتیں مراد ہوں گی جن کے یہ آغاز میں ہیں! اس بناء پر کہ یہ ان کے القاب ہیں یا اس کے علاوہ ہوگا دوسری صورت باطل ہے کیونکہ اس وقت یہ دو حال سے خالی نہیں یا تو اس سے وہ مراد ہوگا جو ان کے لیے عرب میں وضع ہوا ظاہر ہے کہ ایسا نہیں (کیونکہ اسم کسی شی کے لیے وضع نہیں کیا گیا) یا اس کا غیر مراد ہوگا یعنی غیر موضوع لہٗ تو یہ دوسری صورت باطل ہے۔ کیونکہ اس سے قرآن حکیم کا غیر عربی ہونا لازم آتا ہے ثابت ہو گیا کہ یہ سورتوں کے اسماء ہیں۔

سوال نمبر ۶۹: مفسر علیہ الرحمہ نے لا یقال لم لا یجوز کے تحت چار وجوہ بیان کی ہیں ان چاروں کی وضاحت مطلوب ہے؟

جواب:

(۱) یہ حروف مقطعات اس بات پر تنبیہ اور دلالت کے لیے زائد کیے گئے ہیں کہ پہلا کلام ختم ہو گیا ہے اور دوسرا نیا کلام شروع ہو رہا ہے (جیسا کہ قطرب کا قول ہے)

(۲) ان حروف سے ایسے کلام کی طرف اشارہ ہے جن سے یہ حروف مختصر کیے گئے ہیں جس طرح شاعر نے اپنے قول میں اختصار کیا ہے۔ قولہ قلت لها قفی فقالت لی قاف (تو یہاں وقفت' یا اقف کی جگہ قاف کہا گیا اختصار کرتے ہوئے) اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ الف سے مراد الاء اللہ ہیں اور لام سے مراد اللہ تعالیٰ کا لطف اور میم سے مراد اللہ تعالیٰ کا ملک۔ اور آپ ہی سے مروی ہے کہ الف اسم اللہ تعالیٰ سے ہے اور لام اسم جبریل علیہ السلام سے ہے اور میم اسم محمد رسول اللہ ﷺ سے نیز آپ سے مروی ہے کہ الر' وحم' ون' اس کا الرحمن مجموعہ ہے اسی طرح آپ سے مروی ہے کہ الم کا معنی انا اللہ تعالیٰ اعلم ہے اسی طرح باقی سورتوں کے

فواتح کا حال ہے)

(۳) ان حروف کے اعداد کے اعتبار سے قوموں کی مدتیں اور آجال مراد ہیں۔ جس طرح کہ ابو العالیہ نے کہا اس مروی حدیث سے دلیل پکڑتے ہوئے کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس جب یہودی آئے تو آپ نے ان پر الم البقرہ تلاوت فرمائی تو انہوں نے اس کا حساب لگایا اور کہا ہم کیسے اس دین میں داخل ہوں جس کی مدت اے سال ہے تو رسول اکرم ﷺ نے مسکرا دیے پھر انہوں نے کہا اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ تو آپ نے فرمایا المص ' الر ' المر تو انہوں نے کہ آپ نے ہم پر معاملہ خلط ملط کر دیا ہم نہیں جانتے کہ ان میں سے کس کو لیں۔ تو نبی اکرم ﷺ کا ان حروف کی اس ترتیب سے ان پر تلاوت فرمانا اور ان کے استنباط پر خاموشی اختیار فرمانا اس بات (مدد آجال مراد ہونا) پر دلیل ہے۔

(۴) یہ حروف مبسوط پر دال ہیں ان سے قسم کھائی گئی ہے ان کے شرف کی وجہ سے کیونکہ یہ

اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ کے مفردات اور اس کے خطاب کے اصل ہیں۔

سوال نمبر ۷: امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ان وجوہ کو جو لا یقال لم لا یجوز کے تحت بیان کی گئی ہیں پسند کیا یا نہیں اگر نہیں تو ان کا جواب کیا دیا ہے؟

جواب: مفسر نے ان وجوہ کو پسند نہیں کیا لہذا ترتیب وار ان کا رد کیا۔

(۱) ایسی کوئی مثال نہیں جس میں یہ حروف انقطاع پر تنبیہ و دلالت کے لیے زائد کیے گئے ہوں اور رہی بات استیناف کی تو وہ ان حروف کو اور ان کے غیر کو بھی (مثلاً سبحان الذی تبارک الذی وغیرہ) لازم ہے اس حیثیت سے کہ وہ سورتوں کے فواتح ہیں اور یہ بات تقاضا نہیں کرتی کہ ان حروف کا ان کی ذات میں کوئی معنی

نہ ہو یہاں تک کہ انہیں زائد کہا جائے۔

(۲) اہل عرب کی لغت میں ہے حروف' کلمات معینہ سے اختصار کے لیے مستعمل نہیں ہیں رہی بات شعر کی تو وہ شاذ ہے۔اور رہا قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تو وہ تو اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہ حروف اسماء کا منبع ہیں اور خطاب کے مبادی ہیں اور امثلہ حسنہ کے ساتھ تمثیل ہے۔کیونکہ آپ نے ہر حرف کو کلمات متباینہ سے شمار کیا وہاں یہ کوئی تخصیص نہیں کہ یہ معانی مراد ہیں دوسرے نہیں۔

(۳) یہ حروف مدت اقوام کے لیے بھی وضع نہیں کیے گئے کہ ان کو معربات کے ساتھ ملایا جائے اور حدیث پاک میں اس بات پر دلالت بھی نہیں ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے ان کی جہالت سے تعجب فرماتے ہوئے تبسم فرمایا۔

(۴) ان کو مقسم بہا بنانا اگر چہ ممتنع نہیں لیکن اس صورت میں چند چیزوں کو پوشیدہ ماننے کی ضرورت پیش آئے گی جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

سوال نمبر ا: حروفِ مقطعات کو اسماء قرآن قرار دینے پر امام بیضاوی نے کیا دلیل دی ہے نیز انہوں نے فرمایا و لذلك اخبر عنها بالكتب و القرآن حالانکہ لفظ قرآن ان اسماء کی خبر کے طور پر واقع نہیں ہوا اس کے باوجود لفظ قرآن کا ذکر کیوں کیا گیا؟

جواب: دلیل: حروفِ مقطعات کے اسماء قرآن ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان میں سے بعض حروف کو کتاب اور قرآن سے تعبیر کیا گیا ہے (جیسے الم ذلك الكتب' المص كتاب انزل' الر كتب احكمت' المر تلك ايت الكتب وقرآن مبين' طس تلك ايت القرآن وكتب مبين۔)

لفظ قرآن اگر چہ ان اسماء کی خبر کے طور پر واقع نہیں ہوا لیکن کتاب سے مراد بھی قرآن ہے اور مصنف نے الکتاب پر القرآن کا عطف لا کر اسی کی طرف اشارہ کیا۔

سوال نمبر۲۷: کیا حروفِ مقطعات کے مفہوم کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اگر اسے خاص مانا جائے تو کیا خرابی لازم آتی ہے مفسر علیہ الرحمہ نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی وضاحت کریں؟

جواب: یہ حروف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں لیکن آپ کے علاوہ کسی اور کو سمجھانے کا قصد نہیں فرمایا گیا۔ کیونکہ یہ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص مانا جائے تو پھر اس سے یہ لازم آئے گا کہ نبی اکرم ﷺ کو ایسی چیز کے ساتھ خطاب کیا جائے جو غیر مفید ہے۔

سوال نمبر۲۳: حروفِ مقطعات کے اعراب کے حوالے سے وضاحت کریں کہ کن کن صورتوں میں یہ محلِ اعراب ہوگا اور کن صورتوں میں محلِ اعراب نہیں ہوگا۔ نیز رفع، نصب اور جر کے حوالے سے وجوہ بیان کریں اور یہ بھی بتائیں کہ اعرابِ لفظی کہاں ہوگا اور حکایت کا تعلق کن کن حروفِ مقطعات سے ہوگا؟

جواب: اگر ان حروف کو اسماء اللہ تعالیٰ، اسماء القرآن یا اسماء السور بنایا جائے تو ان صورتوں میں ان کے لیے اعراب سے حصہ ہوگا اور اگر ان کو کلمات کا بعض مانا جائے یا ایسی آوازیں مانا جائے جو حروفِ تنبیہ کے قائم مقام ہیں تو ان صورتوں میں ان حروف کے لیے اعراب سے محل نہیں ہوگا (کالجمل المبتداۃ والمفرداتِ المعدودۃ)

پہلی صورت میں جب ان کے لیے محل من الاعراب ہو تو یا تو مرفوع ہوں گے اور ان پر رفع مبتداء ہونے یا خبر ہونے کی بنا پر ہوگا۔ یا ان پر نصب ہوگا فعل قسم کے مقدر ہونے کے ساتھ یا ان پر جر ہوگی حرفِ قسم کے مضمر ہونے کی بناء پر۔

اعراب لفظاً اور حکایۃً (پہلی حالت پر باقی رہنا) ان حروفِ مقطعات میں آتا ہے جو مفرد ہوں یا مفرد کے وزن پر ہوں جیسے حم یہ ھابیل (مفرد) کے وزن پر ہے اور

فقط حکایت ان دونوں کے علاوہ (وہ مفرد نہ ہوں اور مفرد کے وزن پر بھی نہ ہوں) میں آتی ہے۔

سوال نمبر ۷۴: کیا حروف مقطعات ان سورتوں کی آیات شمار ہوتے ہیں جن کے شروع میں ان کو لایا گیا ہے یا نہیں اس سلسلے میں تفسیر بیضاوی کیا کہتی ہے؟

جواب: اس بارے میں کوفیوں اور غیر کوفیوں کا اختلاف ہے غیر کوفیوں کے نزدیک حروف مقطعات میں سے کوئی بھی آیت شمار نہیں ہوتا۔ لیکن کوفیوں کے نزدیک الم اپنی جگہوں میں المص' کھیعص' طہ' طسم' یس' حم' یہ ایک ایک آیت ہیں اور حم عسق دو آیتیں ہیں اور باقی حروف آیات نہیں (وھذا توقیف لامجال للقیاس فیہ)

سوال نمبر ۷۵: ذلك کا مشار الیہ الم کن صورتوں میں بنتا ہے نیز اسم اشارہ کو اشارۂ بعید اور مذکر کیوں لایا گیا؟

جواب: اگر یہ تاویل کی جائے (مقدر عبارت نکالی جائے) المؤلف من هذه الحروف یا تفسیر کی جائے السورة یا القرآن کے ساتھ تو ان صورتوں میں ذلك سے اشارہ الم کی طرف ہوگا۔ ارشارۂ بعید اس لیے لایا گیا کہ اس سے کلام ہو گیا اور گذر گیا یا اس لیے کہ یہ مرسل سے مرسل الیہ کی طرف پہنچ گیا تو بعید ہو گیا۔ الم سے جب سورة مراد ہو تو اب اسم اشارہ کو مذکر اس لیے لایا گیا کہ کتاب مذکر ہے اور کتاب ذلك کی خبر ہے یا یہ اس کی صفت ہے اس لیے موصوف یا مبتدا کو مذکر لایا گیا۔

سوال نمبر ۷۶: اسم اشارہ کا مشار الیہ الکتاب کو قرار دیا جائے تو الکتاب ترکیب میں کیا واقع ہوگی نیز یہ بتائیں کہ لفظ کتاب مصدر ہے اسے مفعول کی جگہ کیوں لایا گیا اور لکھنے سے پہلے اسے کتاب کیسے قرار دیا گیا؟

جواب: اس صورت میں الکتاب ذلك کی صفت واقع ہوگی' مصدر کو مفعول کی جگہ یا تو

مبالغہ کے لیے لایا گیا ہے یا یہ مصدر بمعنی للمفعول ہے (لباس کی طرح) اور لکھنے سے پہلے اس پر کتاب کا اطلاق اس لیے کیا گیا کہ بالآخر اسے لکھا جانا تھا تو مستقبل (مـــا یـسؤل الیه) کے اعتبار سے اسے کتاب کہہ دیا گیا۔

سوال نمبر ۷۷: قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے میں لوگوں نے شک کیا ہے اس کے باوجود لا ریب فیه فرمایا گیا اس کی کیا توجیہہ ہوگی؟

جواب: توجیہ: قرآن حکیم واضح ہونے کی وجہ سے نیز اس کی دلیل روشن ہونے کی وجہ سے ایسا کیا گیا کیونکہ عاقل قرآن حکیم کے وحی ہونے اور حد اعجاز کو پہنچا ہونے میں نظرِ صحیح کے بعد شک نہیں کرتا اس اعتبار سے لا ریب فیه فرمایا گیا اس کا یہ معنی نہیں کہ کوئی شک کرتا ہی نہیں۔

سوال نمبر ۷۸: لفظ ریب کا لغوی معنی کیا ہے اور اسے شک قرار دینا کس مناسبت سے ہے؟

جواب: ریـب رابـنـی الشـیء کا مصدر ہے یہ تب کہا جاتا ہے۔ جب تجھ میں ریبۃ حاصل ہو اور ریبہ نفس کے قلق اور اس کے اضطراب کو کہا جاتا ہے شک کو ریب قرار دینا اس مناسبت سے ہے کہ یہ نفس کو قلق میں ڈالتا ہے اور اطمینان کو زائل کر دیتا ہے۔

سوال نمبر ۷۹: ہدایت کا مفہوم واضح کریں اور بتائیں کہ قرآن مجید جب تمام کائنات انسان کے لیے ہدایت ہے تو متقین کے ساتھ اس کا اختصاص کس وجہ ہے اور یہ بھی بتائیں کہ مجمل اور متشابہ قرآن مجید کے ہدایت ہونے میں خلل پیدا نہیں کرتے؟

جواب: ہدایت کا معنی دلالت ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ایسی دلالت ہے جو مطلوب تک پہنچا دے۔ اس ہدایت کا اختصاص متقین کے ساتھ اس وجہ سے فرمایا گیا کہ وہی اس سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کے دلائل سے نفع حاصل کرتے ہیں اگرچہ اس کی دلالت عام ہے ہر ناظر کے لیے چاہے وہ مسلم ہو یا کافر جیسا کہ فرمایا گیا هـدی للناس یا

متقین کا اختصاص اس وجہ سے ہے کہ اس میں غور وفکر کر کے وہی نفع حاصل کر سکتا ہے جس نے اپنی عقل کو روشن کیا ہو اور آیات کے تدبر اور معجزات میں نظر کرنے میں لگا ہو اور نبوت کے پہچان کرنے میں منہمک ہو۔

مجمل اور متشابہ قرآن مجید کے ہدایت ہونے میں خلل نہیں ڈالتے اس لیے کہ دلالت سمع اور عقل سے اس کی مراد متعین ہو سکتی ہے (ھذا عند الشافعیہ والحنفیہ) مجمل اور متشابہ کا ہدایت ہونا اس معنی میں ہے کہ یہ اپنی حقیقت کے اعتقاد اور اپنا علم اللہ تعالیٰ کی طرف تفویض کرنے کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔

سوال نمبر ۸۰: تقوی کا لغوی اور شرعی معنیٰ ذکر کرنے کے بعد اس کے تین مراتب قرآن مجید سے مثالوں کے ساتھ ذکر کریں؟

جواب: تقویٰ کا لغوی معنی فرط الصیانہ (بہت زیادہ بچنا) ہے اور عرف شرع میں متقی اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے نفس کو ہر اس چیز سے بچائے جو اس کے لیے آخرت میں ضرر رساں ہو۔

تقویٰ کے تین مراتب ہیں:

(۱) عذابِ مخلد (جس میں ہمیشہ رہنا ہو) سے بچنا شرک سے بیزاری اختیار کر کے
مثال: الزمھم کلمۃ التقوی تو اس میں کلمہ تقوی سے مراد کلمہ توحید ہے۔

(۲) ہر اس چیز سے بچنا جو گناہ میں ڈالے چاہے وہ فعل ہو یا ترکِ فعل حتی کہ بعض کے نزدیک صغائر سے بھی بچنا اور شرع میں یہی اسمِ تقویٰ سے متعارف ہے۔
مثال: ولو ان اھل القری امنوا واتقوا۔

(۳) اپنے آپ کو ہر اس چیز سے بچانا جو اس کے دل کو حق تعالیٰ سے پھیرے اور اس

کی طرف پوری طرح متوجہ ہونا اور یہی تقویٰ حقیقی ہے مثال واتقوا اللہ حق

تقاتہ۔

سوال نمبر ۱۸: الم سے لے کر ھدی للمتقین تک تمام عبارت کی مختلف تراکیب جو مفسر علیہ الرحمہ نے بیان کی ہیں انہیں واضح کریں اور اس ضمن میں کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے تو اسکی وضاحت مع جواب نقل کریں؟

جواب: الـم مبتداء ہے اس بنا پر کہ یہ قرآن یا سورۃ کا اسم ہے یا یہ مقدر ہوگا المؤلف منھا کی تاویل سے اور ذلك اس مبتدا کی خبر ہے۔ لیکن جب المؤلف منھا مقدر عبارت نکالی جائے تو اس صورت میں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ المؤلف منھا عام ہے اور مبتدا ہے اور ذلك خاص ہے اور اس کی خبر ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ اخص کا حمل اعم پر درست نہیں ہوتا جب کہ مذکورہ ترکیب کی صورت میں یہ خرابی لازم آتی ہے۔

جواب: مؤلف سے مؤلف کامل مراد ہے جو اپنی تالیف میں مکمل واکمل اور فصاحت و بلاغت کے انتہائی درجہ کو پہنچا ہوا ہو۔ تو اب یہ مبتدا خاص ہو جائے گا۔ الکتاب ذلك کی صفت ہے۔

ترکیب نمبر ۲: الم مبتداء محذوف کی خبر ہے (مثلاً ھذا او المتحدی بہ مولف من ھذہ الحروف) اور ذلک خبر ثانی یا خبر اول سے بدل ہے اور الکتاب ذلك کی صفت ہے۔ اور لاریب میں ریب مشہور قول کے مطابق مبنی بر فتحہ ہے اور لا کا اسم ہے لیکن ابو الشعثاء کی قراءۃ میں اس لا کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے جو لا لیس کے معنی میں ہے اور فیہ اس کی خبر ہے۔ یا فیہ ریب کی صفت ہے اور للمتقین اس لا کی خبر ہوگا اور ھدی حال ہونے کی بنا پر منصوب ہوگا۔ یا خبر محذوف ہوگی (فیہ) اور تقدیر عبارت یہ ہوگی لا ریب فیہ فیہ ھدی للمتقین۔

ترکیب نمبر۳: ذلك مبتداء اور الكتاب اس کی خبر (سوال پیدا ہوا کہ مبتدا خبر دونوں معرفہ ہوگئے جس سے حصر لازم آیا کہ یہی کتاب ہے اور کوئی نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ کتاب سے مراد کامل کتاب ہے جو کہ کتاب کہلانے کی اہل ہے اور وہ فقط قرآن حکیم ہے لہذا حصر درست ہوگیا) یا الكتاب صفت ہوگی اور اس کا مابعد ذلك کی خبر اور مبتدا اور خبر مل کر مبتدا کی خبر ہو جائیں گے۔

سوال نمبر۸۲: مصنف علیہ الرحمہ نے و الاول فرما کر چار جملوں کا ذکر فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ ہر آنے والا جملہ پہلے جملے کو پکا کرتا ہے ان چار جملوں کی وضاحت اور جملۂ لاحقہ کا جملۂ سابقہ کو پکا کرنے کی توضیح پیش کریں؟

جواب: الم ایک جملہ ہے (محذوف المبتدا او الخبر) جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ متحدی بہ اس کی جنس سے ہی مرکب ہے جس سے وہ اپنے کلام کو مرکب کرتے ہیں ذلک الکتاب دوسرا جملہ ہے اور اس نے جہۃ تحدی کو پختہ کر دیا بایں صورت کہ یہی وہ کتاب جس کی صفت غایتِ کمال کے ساتھ لائی گی۔ اور پھر نفی ریب سے اس کے کمال پر مہر لگا دی گئی۔ لا ریب فیه تیسرا جملہ ہے جو اس کتاب کے کمال کی گواہی دیتا ہے کیونکہ حق اور یقین سے اعلیٰ کوئی کمال نہیں اور هدی للمتقین (اپنے مقدر مبتدا کے ساتھ) چوتھا جملہ ہے جو اس کتاب کے ایسا حق ہونے کو پختہ کرتا ہے جس کے گرد شک کی مجال نہیں پختہ اس طرح کیا کہ متقین کے لیے ہدایت ہے اور جو متقین کے لیے ہدایت ہو اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی اور جس کتاب میں شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو وہ حدِ کمال کو پہنچی ہوتی ہے او جو کتاب حدِ کمال کو پہنچی ہو اس سے معارضہ ممکن نہیں۔

سوال نمبر۸۳: مصنف نے ایک اور صورت بیان کی ہے وہ یہ کہ ہر پہلا جملہ بعد والے جملے کو اپنے پیچھے یوں لاتا ہے جیسے دلیل مدلول کو لاتی ہے اس بات کی وضاحت کیجیے؟

جواب: اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہر بعد والا جملہ پہلے والے جملے کا مدلول ہے اور پہلا جملہ اس کی دلیل وعلت (جیسے دور سے دھواں نظر آئے تو یہ آگ کی دلیل ہے لہذا مدلول بعد میں نظر آئے گا) اسی طرح یہاں بھی پہلا جملہ دوسرے جملے کی دلیل ہوگا۔ جس کی وضاحت یوں ہے کہ جب اس بات پر تنبیہ فرمائی گئی کہ متحدی بہ معجز ہے اس حیثیت سے کہ یہ ان کے کلام کی جنس سے ہے اور وہ اس کے معارضہ سے بھی عاجز آ گئے تو اس سے نتیجہ نکلا کہ یہ ایسی کتاب ہے جو حد کمال کو پہنچنے والی ہے اور یہ بات اس کو مستلزم ہے کہ اس کے اطراف کے ساتھ شک چنگل نہ مار سکے (کیوں کہ جس کلام میں شک ہو اس سے زیادہ ناقص شی کوئی نہیں ہوگی) اور جو اس طرح ہو یقیناً وہ متقین کے لیے ہدایت ہوگی۔

سوال نمبر ۸۴: ان چاروں جملوں میں سے ہر جملے میں ایک یا اس سے زائد نکات ہیں ان کی تفصیل قلمبند کریں؟

جواب: پہلے جملے میں حذف متبدا اولخبر ہے جس سے اس کا معجز ہونا معلوم ہوتا ہے اور اس میں مقصود (تحدی یا طلب معارضہ یا اس کا کلام اللہ تعالیٰ ہونا) کی طرف باوجود تعلیل (کہ وہ عاجز آ گئے اگر وہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو البتہ وہ اس کے معارضہ پر قادر ہوتے کیونکہ یہ اسی سے مرکب ہے جس سے وہ اپنے کلام کو مرکب کرتے ہیں۔)

اور دوسرے جملہ (ذلك الكتاب) میں الف لام تعریف کو لا کر اس کی عظمت بڑھا دی (اس طرح اس میں حصر ہو گیا کہ یہی کتاب کامل اور کتاب کہلانے کے لائق ہے)

اور تیسرے جملے (لاریب فیہ) میں ظرف کو مؤخر کیا گیا ایہام باطل سے بچتے ہوئے (کیونکہ اگر ظرف مقدم ہوتا تو حصر پیدا ہو جاتا فقط اس میں شک نہیں حالانکہ باقی آسمانی کتابوں میں بھی شک نہیں ہے)

اور چوتھے جملے میں حذف ہے یعنی ھدی سے پہلے ھو مبتداء محذوف ہے اور

مصدر کے ساتھ موصوف کیا گیا مبالغہ کے لیے ھدی کو نکرہ لایا گیا تعظیم کے لیے اور ہدایت کی تخصیص متقین کے ساتھ غایت کے اعتبار سے ہے اور مشارف ای مقارب للتقوی کا نام رکھنا اختصار ہے کلام میں یا اس کی شان کی عظمت بیان کرنے کے لیے۔

سوال نمبر ۸۵: الذین یؤمنون بالغیب کی ترکیب کے ضمن میں مفسر نے دو صورتیں ذکر کی ہیں۔

(۱) المتقین کے ساتھ موصول ہو۔

(۲) اس سے مفصول ہو۔

پہلی صورت میں صفت مجرورہ ہوگا تو بتایئے کہ صفت کی تین قسمیں کون کونسی ہیں اور ان کی تعریفات کیا ہیں اور یہاں ان تین اقسام کی مطابقت کیسے ہوگی؟

جواب: صفت کی تین اقسام ہیں:

(۱) صفتِ مقیدہ (۲) صفتِ موضحہ (۳) صفتِ مادحہ

وجہ حصر: اگر صفت کا مفہوم موصوف کے مفہوم کا عین ہو (کہ وہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہو سکیں) موصوف مجمل ہو صفت اس کو مفصل و مبین کر دے تو اس کو صفت کاشفہ و موضحہ کہتے ہیں۔ اگر صفت کا مفہوم موصوف کے مفہوم سے خارج ہو بایں صورت کہ صفتِ ان بعض احوال پر دلالت کرے جو موصوف سے خارج ہیں تو اس کو صفتِ مخصصہ و مقیدہ کہتے ہیں اور اگر موصوف مخاطب کو معلوم ہو صفت کے اجراء سے پہلے تو اس صورت میں صفت مادحہ ہوگی۔

صفت مقیدہ تب ہوگی جب تقوی کی تفسیر ترک مالایعنی سے کی جائے تو اس کے احوال سے ایمان بالغیب، اقامۃ الصلوۃ وغیرہ خارج ہوں گے تو یہ صفت انہیں اس میں داخل کر دے گی۔ اور اگر تقوی کی تفسیر اس سے کی جائے جو فعلِ حسنات اور ترک سیئات کو

شامل ہے تو اس صورت میں صفت موضحہ ہوگی کیونکہ متقین سے جو اجمالاً سمجھا جارہا تھا الذین صفت نے اس کو بیان کردیا۔ یا صفت مادحہ ہوگی اس صورت میں کہ متقین سے بعینہ وہی مراد ہوں جن کا الذین الخ صفات میں ذکر کیا گیا تو اب صفت ان کی مدح کے لیے ہوگی۔

سوال نمبر ۸۶: اگر یؤمنون بالغیب کو مفصول عنہ قرار دیا جائے تو ترکیب اور وقف کے لحاظ سے کیا صورت ہوگی؟

جواب: اس صورت میں الذین مرفوع بالابتداء ہوگا اور اس کی خبر اولئك علی هدی ہوگی اور متقین پر وقف تام ہوگا۔

سوال نمبر ۸۷: ایمان کا لغوی معنی ذکر کریں اور اصطلاحی ایمان کے ساتھ اس کی مطابقت بھی بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ تعدیہ کے لیے باء کو کیوں لایا گیا؟

جواب: ایمان لغت میں عبارت ہے تصدیق سے اور یہ امن سے ماخوذ ہے مصدق کو مومن اس لیے کہتے ہیں کہ گویا کہ اس نے مُصَدَّق کو تکذیب ومخالفت سے امن دے دیا۔

تعدیہ کے لیے باء کو اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ اعتراف کے معنی کو متضمن ہے۔

کبھی ایمان وثوق کے معنی میں بھی آتا ہے اس حیثیت سے کہ واثق امن والا ہو جاتا ہے۔

سوال نمبر ۸۸: شریعت میں ایمان کسے کہتے ہیں اور کیا اقرار اور عمل ایمان کی تعریف میں داخل ہیں اس سلسلے میں مختلف مذاہب ذکر کریں نیز یہ بتائیں کہ منافق، کافر اور فاسق میں کیا فرق ہے اور فاسق کے بارے میں خوارج اور معتزلہ کا کیا عقیدہ ہے؟

جواب: شریعت میں ایمان التصدیق بما علم بالضرورة انه من دین محمد ﷺ (اس کی تصدیق کو کہتے ہیں جس کے بارے میں بداہتاً معلوم ہو کہ یہ دین محمد ﷺ سے ہے) کو کہتے ہیں جیسے توحید، نبوت، بعث، جزاء۔

جمہور محدثین، معتزلہ اور خوارج کے نزدیک ایمان تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے اعتقاد الحق، الاقرار به، العمل لمقتضاه۔ جو فقط اعتقاد میں خلل ڈالے تو وہ منافق ہے اور جو اقرار میں خلل ڈالے وہ کافر مجاہر ہے اور جو عمل میں خلل ڈالے تو فاسق ہے اس پر تو سب کا اتفاق ہے لیکن خوارج کے نزدیک مخل بالعمل خارج عن الایمان ہے اور معتزلہ کے نزدیک خارج عن الایمان غیر داخل فی الکفر ہے۔

سوال نمبر ۸۹: ایمان صرف تصدیق کا نام ہے اس عقیدہ پر عقلی اور نقلی دلائل ذکر کریں اور یہ بھی بتائیں کہ کیا تصدیق بالقلب کے لیے اقرار باللسان ضروری ہے کہ نہیں جو لوگ ضروری مانتے ہیں ان کی دلیل اور مخالفین کی طرف سے اس کا جواب بھی ذکر کریں؟

جواب: ایمان صرف تصدیق کا نام ہے اس پر چند دلائل یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر ایمان کی اضافت قلب کی طرف فرمائی جیسے كتب فی قلوبهم الایمان وقلبه مطمئن بالایمان، ولم تومن قلوبهم ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔ نیز ایمان پر عمل صالح کا عطف متعدد جگہ کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان فقط تصدیق بالقلب کا نام ہے نیز ایمان کو معاصی کے ساتھ بھی متعدد جگہوں پر لایا گیا جیسے وان طائفتان من المومنین اقتتلوا، یا ایها الذین امنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی۔ ولم یلبسوا ایمانهم بظلم۔ نیز ایمان سے فقط تصدیق مراد لینے میں لغوی معنی میں تغیر کم لازم آتی ہے۔ (کیونکہ ایمان تصدیق کا نام ہے اور یہ شرعی ایمان تصدیق بالقلب) جبکہ باقی دو صورتیں مراد لینے میں تغییر زیادہ لازم آتی ہے۔

اس بارے میں اختلاف ہے کہ مجرد تصدیق بالقلب کافی ہے یا تمکن کے لیے

اقرار ساتھ ملانا بھی ضروری ہے دوسرے مذہب والوں کے دلائل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معاند (من یعلم الحق ولا یعترف) کی مذمت جاہل مقصر کی مذمت سے زیادہ فرمائی جس سے معلوم ہوگیا کہ اقرار بھی ضروری ہے۔

مخالفین نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مذمت انکار کی وجہ سے فرمائی نہ کہ عدمِ اقرار کی وجہ سے لہذا اس سے اقرار کا لازم ہونا مستدل نہیں ہوتا۔

سوال نمبر ۹: غیب کا لغوی اور اصطلاحی معنی ذکر کر کے اس کی دو قسمیں جو مصنف نے بیان کی ہیں ان کی وضاحت کریں اور یہ بتائیں کہ وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمها الا ھو اس آیت کی روشنی میں حضور اکرم ﷺ کے لیے علمِ غیب ماننا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

جواب: غیب مصدر ہے (وصف بہ للمبالغۃ) عرب مطمئن زمین کو اور پہلو کی جگہ جو کہ پست اور چھپی ہوتی ہے غیب کہتے ہیں یہ بھی کہا گیا ہے یہ اصل میں غیب فیعل کے وزن پر ہے پھر اس میں تخفیف کردی گئی۔ اور غیب کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ الخفی الذی لا یدرکہ الحس ولا یقتضیہ بداھۃ العقل (وہ خفی کہ حس جس کا ادراک نہ کر سکے اور بداہتاً عقل اس کا تقاضا نہ کرے۔)

غیب کی دو قسمیں ہیں

(۱) جس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو ھو المعنی بقولہ تعالیٰ وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمها الا ھو۔

(۲) جس پر دلیل قائم ہو کالصانع وصفاتہ والیوم الاخر واحوالہ وھو المراد بہ فی الآیۃ الذین یؤمنون بالغیب الآیۃ۔

وعندہ مفاتح الغیب الآیۃ۔ میں جس غیب کا اللہ تعالیٰ کے لیے حصر کیا گیا وہ علمِ غیب ذاتی (یعنی بغیر کسی کے عطا کرنے کے) اور رہی بات عطا کرنے کی تو اس میں نفی

نہیں۔

سوال نمبر ۹۱: لفظِ غیب سے کیا مراد ہے اس سلسلے میں مصنف نے جو صورتیں بیان کی ہیں ان کا تفصیلی ذکر کر کے یہ بتائیں کہ بالغیب پر جو باء داخل ہے اس کی حیثیت کیا ہوگی۔

جواب: جب لفظِ غیب کا صلہ بنایا جائے اور مفعول بہ کی جگہ واقع کیا جائے تو اس سے مراد الخفی الذی لا یدرکه الحس ولا یقتضیه بداهة العقل ہوگی۔ لیکن اگر بالغیب کو حال بنائیں ملتبسین بالغیب تقدیرِ عبارت نکال کر تو اب یہ غیب اور خفا کے معنی میں ہوگا اور معنی یہ ہوگا کہ وہ ایمان لاتے ہیں اس حال میں کہ وہ تم سے غائب ہوتے ہیں (لاکا لمنافقین الذین اذا لقوا الذین امنوا قالوا امنا واذا خلوا الی شیاطینهم قالوا انا معكم یا وہ ایمان رکھتے ہیں اس حال میں کہ وہ موقن بہ (نبی کریم ﷺ) سے غائب ہوتے ہیں لما روی ابن مسعود رضی الله عنهما قال والذی لا اله غیره ما امن احد افضل من ایمان بغیب پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

یا غیب سے مراد قلب ہے اور معنی یہ بنے گا وہ اپنے دلوں کے ذریعے ایمان لاتے ہیں لا کمن یقولون بافواههم ما لیس فی قلوبهم پہلی صورت (جب بالغیب کو صلہ و مفعول بہ قرار دیا جائے) میں باء تعدیہ کے لیے ہوگی اور دوسری صورت (جب بالغیب حال واقع ہو) میں باء مصاحبت کے لیے ہوگی اور تیسری صورت (جب بالغیب سے قلب مراد ہو) میں با آلہ کے لیے ہوگی۔

سوال نمبر ۹۲: صاحب تفسیر نے اقامة الصلوة کے کتنے اور کون کون سے معانی بیان کیے ہیں اس سلسلے میں لغوی تائیدات بھی پیش کریں؟

جواب:

(۱) یقیمون الصلوۃ کا معنی ہے یعدلون ارکانھا ویحفظونھا ان یقع زیغ فی افعالھا (وہ تعدیل ارکان کرتے ہیں نیز نماز کی اس بات سے حفاظت کرتے ہیں کہ اس کے افعال میں ٹیڑھاپن واقع ہو) یہ اقام العود (یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی لکڑی کو سیدھا کر دے) سے ماخوذ ہے۔

(۲) یقیمون الصلوۃ کا معنی ہے یواظبون علیھا (وہ ہمیشگی سے نماز ادا کرتے ہیں) یہ قامت السوق (یہ تب کہا جاتا ہے جب بازار چالو ہو جائے) سے ماخوذ ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا

اقامت غزالۃ سوق الضراب اقامت لا ھل الراقین حولا قیماطا

ترجمہ: غزالہ نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا عراقیوں کے لیے مکمل سال

کیونکہ جب نماز کی حفاظت کی جائے گی تو یہ اس نافق کی طرح ہو جائے گی جس میں رغبت کی جاتی ہے اور جب نماز کو ضائع کر دیا جائے تو یہ اس کاسد (مندا) کی طرح ہو جائے گی جس سے اعراض کیا جاتا ہے۔

(۳) یقیمون الصلوۃ کا معنی ہے کہ یتشمرون لاداثھا من غیر فتور ولا توان (وہ اس کی ادائیگی میں بغیر کسی کمی اور کوتاہی کے کوشش کرتے ہیں) یہ عربوں کے اس محاورے سے ماخوذ ہے قام بالامر واقامہ (یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ اس میں کوشش کرے اور شدت اختیار کرے)

(۴) یقیمون الصلوۃ کا معنی یؤدونھا ہے تو نماز کی ادائیگی کو اقامۃ سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ نماز بھی قیام پر مشتمل ہوتی ہے کما عبر عنھا بالقنوت والرکوع والسجود والتسبیح۔

سوال نمبر ۹۳: مصنف علیہ الرحمۃ نے اقامۃ الصلوۃ کے کونسے معنی کوزیادہ ظاہر قرار دیا ہے اور اس پر کیا دلائل پیش کیے ہیں؟

جواب: مصنف علیہ الرحمۃ نے پہلے معنی (یعدلون ارکانها ویحفظونها ان یقع زیغ فی افعالها) کوزیادہ ظاہر قرار دیا ہے اور اس پر دلائل یہ دیے ہیں کہ یہ معنی زیادہ مشہور ہے اور حقیقت کے زیادہ قریب ہے (کیونکہ چاروں معانی مجازی ہیں لیکن معنی اول حقیقت کے زیادہ قریب ہے) مصنف نے حقیقت سے حقیقت عرفی مراد لی ہے اور وہ تقویم العود وتسویة اجزائه وازالة اعوجاجه ہے) نیز اس نے اس بات کا فائدہ بھی دیا کہ مدح کے لائق وہی ہے جونماز کے ظاہری حقوق (فرائض وسنن وغیرہ) اور باطنی حقوق (خشوع، اقبال بقلبہ علی اللہ تعالی) کی رعایت کرے لا المصلون الذین هم عن صلاتهم ساهون اسی وجہ سے سیاق مدح میں والمقیمین الصلوۃ اور معرض ذم میں فویل للمصلین ذکر کیا گیا۔

سوال نمبر ۹۴: لفظ صلوۃ کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق ذکر کریں اور یہ بتائیں کہ نماز کوصلوۃ کیوں کہتے ہیں اور دعا کوصلوۃ کہنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: صلوۃ فَعَلَۃٌ کے وزن پر ہے صلی سے ماخوذ ہے (یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی دعا کرے جس طرح کہ زکوۃ زکی سے ماخوذ ہے نماز کوصلوۃ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ صلی اصل میں سرین ہلانے کو کہتے ہیں تو اس صورت میں نمازی کومصلی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ رکوع وسجود میں یہ فعل کرتا ہے۔ اور دعا کرنے والے کومصلی اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کوراکع وساجد کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے خشوع میں۔

سوال نمبر ۹۵: رزق کا لغوی اور عرفی معنی کیا ہے اور اس سلسلے میں اہل سنت

وجماعت اور معتزلہ کے درمیان اختلاف کس بات میں ہے دونوں طرف کے دلائل ذکر کرنے کے بعد اہلسنت کی ترجیح واضح کریں؟

جواب: لغت میں رزق حصے کو کہتے ہیں قال اللّٰہ تعالیٰ ویجعلون رزقکم انکم تکذبون تم جھٹلانے کو اپنا حصہ بناتے ہو۔ اور عرف نے اسے خاص کر دیا کہ شئ کو حیوان کے ساتھ خاص کر دینا اور اس کو اس شی سے نفع حاصل کرنے کی قدرت دینا۔

معتزلہ اور اھل سنت وجماعت کے درمیان اختلاف اس بات میں ہے کہ معتزلہ حرام کو رزق تسلیم نہیں کرتے جب اہل سنت وجماعت حرام کو بھی رزق تسلیم کرتے ہیں۔

معتزلہ کے دلائل:

یہ بات محال ہے کہ اللہ تعالیٰ حرام پر قدرت دے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حرام سے نفع حاصل کرنے سے منع فرمایا اور اس سے رکنے کا حکم فرمایا۔ نیز اس آیت (ومما رزقنھم ینفقون) میں رزق کی نسبت اپنی طرف فرمائی یہ بتاتے ہوئے کہ وہ خالص حلال کو خرچ کرتے ہیں کیونکہ انفاق حرام موجب مدح نہیں حالانکہ یہ مقامِ مدح ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی مذمت فرمائی اس چیز کے حرام کرنے پر جو اللہ تعالیٰ نے انہیں رزق میں عطا فرمائی۔ بقولہ تعالیٰ قل ارایتم ما انزل اللّٰہ لکم من رزق فجعلتم منہ حراما وحلالا۔

اہل سنت کی طرف سے جواب ودلائل:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف رزق کی نسبت فرمائی اس کی عظمت بیان کرنے کے لیے اور انفاق پر ابھارنے کے لیے اور اللہ تعالیٰ نے مذمت اس لیے فرمائی کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں فرمایا اس کو انہوں نے حرام قرار دیا۔ اور ممارزقناھم کا اختصاص حلال کے ساتھ قرینۂ مدح کی وجہ سے ہے اس لیے نہیں کہ حلال ہی رزق ہوتا

ہے۔ نیز اہل سنت و جماعت نے رزق کے حلال و حرام دونوں کو شامل ہونے کا استدلال حدیث مبارک سے کیا۔ بقوله عليه الصلوة والسلام في حديثه عمرو بن قرة لقد رزقك الله طيبا فاخترت ما حرم الله عليك من رزقه مكان ما احل الله لك من حلاله تو اس حدیث میں فرمایا گیا ما حرم عليك من رزقه کہ تو نے اس کو اختیار کیا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رزق میں سے تجھ پر حرام فرمایا تو حرام پر رزق کا اطلاق فرمایا گیا۔ نیز اگر حرام رزق نہ ہوتا تو جو شخص پوری عمر حرام سے غذا حاصل کرنے والا ہے وہ مرزوق نہ رہے گا حالانکہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا وما من دابة في الارض الا على الله رزقها تو قرآن وسنت کے دلائل کی روشنی میں جہاں معتزلہ کا رد ہو گیا وہاں مسلک اہل سنت و جماعت کی ترجیح بھی ثابت ہو گئی کہ انہوں نے قرآن وسنت سے استدلال صحیح کیا۔

سوال نمبر ۹۶: انفاق فی سبیل اللہ کو بعض لوگوں نے زکوۃ کے ساتھ خاص کیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس لیے کہ زکوۃ انفاق کی انواع میں سے افضل اور اصل ہے یا اس وجہ سے انفاق کو زکوۃ کے ساتھ خاص کیا کہ زکوۃ اس چیز کے ساتھ ملی ہوتی ہے جو اس کی مترادف ہے یعنی نماز کے ساتھ اس کو ذکر کیا گیا تو جس طرح نماز فرض ہے اسی طرح انفاق کا وہ فرد مراد ہو گا جو فرض ہے اور وہ زکوۃ ہے۔

سوال نمبر ۹۷: مفعول کی تقدیم اور من تبعیضیہ لانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے اور ويحتمل ان يراد به الانفاق الخ عبارت سے مصنف کیا بتانا چاہتے ہیں؟

جواب: مفعول کی تقدیم اس کی اہمیت کی وجہ سے ہے (مما کی تقدیم ينفقون سے) نیز آیتوں کے اواخر کی مطابقت کے لیے اس کو مقدم کیا گیا۔ اور من تبعیضیہ اس اسراف سے

رکنے کے لیے داخل کیا گیا جس سے روکا گیا ہے۔

ویحتمل ان الخ: یہاں سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ آیت اس بات کی بھی محتمل ہے کہ انفاق تمام نیکی کے کاموں میں مراد ہو۔ جو اللہ عزوجل نے ان کو ظاہری و باطنی نعمتوں سے عطا فرمائے۔ اس کی تائید نبی اکرم ﷺ کا ارشاد کرتا ہے کہ وہ علم جسے کہا نہ جائے (جسے بیان نہ کیا جائے) اس خزانے کی طرح ہے جسے خرچ نہ کیا جائے اس سے معلوم ہوا کہ علم کا خرچ کرنا بھی اس انفاق میں داخل ہے۔ والیہ ذھب من قال ومما خصصناھم بہ من انوار المعرفۃ یفیضون۔

سوال نمبر ۹۸: والذین یؤمنون سے من قبلك تک اس عبارت کا عطف کس پر ہے۔ عطف کے حوالے سے مختلف مذکورہ صورتوں کو واضح کرتے ہوئے ان کی روشنی میں ان لوگوں کا تعین کریں جو اس آیت میں مراد ہیں؟

جواب: اس عبارت کا عطف الذین یؤمنون بالغیب پر ہے اور اس سے مراد اہل کتاب کے مومن ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور آپ کی امثال: اور والذین یؤمنون بما الایۃ یہ الذین یؤمنون بالغیب الایۃ کے ساتھ جملہ متقین میں داخل ہیں جس طرح کہ اخص اعم کے تحت داخل ہوتا ہے کیونکہ الذین یؤمنون بالغیب سے وہ لوگ مراد ہیں جو شرک اور انکار سے محفوظ ہوگئے اور والذین یؤمنون الآیۃ سے مراد اُن کے مقابل لوگ ہیں جو ایک دین سے دوسرے دین کی طرف منتقل ہوگئے۔ لہٰذا دونوں آیتیں متقین کی تفصیل ہوں گی۔ یا اس آیت کا عطف المتقین پر ہوگا گویا کہ یہ فرمایا کہ یہ ہدایت ہے شرک سے بچنے والوں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اہل ادیان میں سے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس آیت سے بعینہ پہلے لوگ الذین والے مراد ہوں۔

سوال: جب دونوں آیتوں سے ایک ہی لوگ مراد ہیں تو درمیان میں حرفِ عطف کیوں لایا گیا؟

جواب: اس میں حرف عطف اسی طرح لایا گیا جیسے شاعر کے قول الی الملك القرم وابن الهمام میں لایا گیا حالانکہ ملك القرم اور ابن الهمام سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ یعنی اسماء اور صفات کے درمیان حرف عطف تغایرِ مفہوم کے اعتبار سے دائر ہوتا رہتا ہے تو ان دونوں آیتوں میں بھی صفات کے مفہومات میں تغایر ہے اس لیے حرف عطف لایا گیا۔

سوال نمبر ۹۹: موصول کا تکرار کس وجہ سے ہے؟

جواب: یہ بتانے کے لیے کہ دونوں راستوں (عقل و سمع) کے درمیان تغایر ہے یا یہ تخصیص بعد التعمیم ہے کہ اولین سے ایک گروہ جو کہ اہل کتاب ہیں ان کو جملہ سے خاص کرتے ہوئے ذکر فرمایا گیا (جس طرح کہ ملائکہ کے ذکر بعد حضرت جبرئیل و میکائیل علیہما السلام کا ذکر کیا گیا) ان کی شان کی عظمت بیان کرنے کے لیے اور ان کی امثال کو رغبت دلانے کے لیے۔

سوال نمبر ۱۰۰: انزال کا معنی کیا ہے اور انزال کا تعلق ذوات سے ہوتا ہے معانی پر انزال کا اطلاق کیسے درست ہوگا؟

جواب: انزال کا معنی نقل الشیء من الاعلی الی الاسفل ہے (شی کو اوپر سے نیچے کی طرف منتقل کرنا ہے) معانی کے ساتھ انزال کا لحوق ان ذوات کے لحوق کے واسطہ سے ہوتا ہے جو ان معانی کو متضمن ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ کتب الٰہیہ کا نزول رسولوں پر اس طرح ہوتا ہو کہ فرشتہ اسے اللہ تعالیٰ سے روحانی طور پر لے لیتا ہو یا فرشتہ لوحِ محفوظ سے اسے یاد کر کے رسولوں کی طرف لے آتا ہو۔

سوال نمبر ۱۰۱: بما انزل الیك سے کیا مراد ہے اور بما انزل من قبلك سے کیا مراد ہے اور ان دونوں پر ایمان لانے میں کوئی تفاوت ہے یا نہیں؟

جواب: بما انزل الیك سے مکمل قرآن اور تمام کی تمام شریعت مراد ہے اور بما انزل من قبلك سے تمام کتب سابقہ مراد ہیں۔ ان دونوں پر ایمان لانا فرضِ عین ہے لیکن اول پر نہ کہ ثانی پر تفصیلاً ایمان لانا فرض کفایہ ہے اس حیثیت سے کہ ہم اس کی تفاصیل سے عبادت کرنے والے ہیں اور فرض کفایہ اس لیے ہے کہ اس کا وجوب ہر ایک پر حرج اور فسادِ معاش کو ثابت کرتا ہے۔

سوال نمبر ۱۰۲: بالآخرة هم یوقنون فرما کر یہود ونصاریٰ کے بعض نظریات کا رد کیا گیا اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ان کے یہ نظریات تھے کہ جنت میں صرف وہی جائے گا جو یہودی یا نصرانی ہو اور آگ انگوٹھی کے چند دن چھوئے گی۔ نیز ان کے اختلاف جنت کی نعمتوں کے بارے میں کہ وہ دنیا کی نعمتوں کی جنس سے ہے یا غیر دنیا کی۔ اور اسی طرح اس کے دوام وانقطاع کو رد کیا گیا لیکن وبالآخرة هم یوقنون جب فرمایا گیا (کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں) تو اس سے ان کے تمام نظریات باطلہ زائل ہو گئے۔

سوال نمبر ۱۰۳: یقین سے کس قسم کا علم مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم کو اس سے موصوف کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

جواب: یقین کہتے ہیں اتقان العلم بنفی الشك والشبهة عنه نظرا واستدلالا علم کو پختہ کرنا شک اور شبہ کی اس سے نفی کر کے نظر واستدلال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے علم کو یقین سے موصوف اس لیے نہیں کر سکتے کہ یقین میں نظر واستدلال کے ذریعے علم پختہ ہوتا جب کہ اللہ تعالیٰ کا علم نظر واستدلال سے پاک ہے۔

سوال نمبر۱۰۴: وبالاخرۃ میں حضرت نافع کی قرأت کیا ہے اور اس پر انہوں نے کیا دلیل دی ہے؟

جواب: امام نافع بالآخرۃ کو تخفیف سے پڑھتے ہیں ہمزہ کو حذف کر کے اور ہمزہ کی حرکت لام کو دے کر۔ اور یوقنون میں واؤ کو ہمزہ سے بدل کر پڑھتے ہیں۔ ماقبل کے ضمہ کی وجہ سے اس کو وجوہ اور وقتت کی واؤ مضمومہ کے قائم مقام کرتے ہوئے کہ انکی واؤ مضمومہ کو بھی ہمزہ سے بدل کر پڑھا جاتا ہے (کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ واؤ مضموم یا مکسور کلمہ کے شروع میں واقع ہو تو اسے ہمزہ سے بدلنا جائز ہے) اسکی نظیر لحب المؤقدان الی مؤسی ہے دوسرا مصرع وجعدۃ اذا اضاء ھما الوقود یہاں موقدان اور موسیٰ میں واؤ کو ہمزہ سے بدلا گیا ہے۔ ماقبل کے ضمہ کی وجہ سے۔

سوال نمبر۱۰۵: اولئك علی ھدی من ربھم کس صورت میں محل رفع میں ہوگا اور یہ کونسا مرفوع قرار پائے گا نیز اسے استنافیہ قرار دینے کی صورت کیا ہوگی؟

جواب: اگر احد الموصولین (والذین یؤمنون الایۃ) کو متقین سے مفصول مانیں تو اولئك الایۃ اس کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہوگا لیکن اگر والذین الآیۃ کو متقین سے مفصول نہ مانیں بلکہ موصول مانیں تو اس صورت میں اولئك الایۃ جملہ مستأنفہ ہوگا اور اس کے لیے محلِ اعراب نہیں ہوگا۔ (اس صورت میں یا تو یہ احکام اور صفاتِ متقدمہ کا نتیجہ ہوگا یا سائل کا جواب ہوگا)

سوال نمبر۱۰۶: لفظ علی یہاں کیا معنی دیتا ہے اور ان لوگوں کا ہدایت پر استقرار کس طرح حاصل ہوگا نیز یہ بھی بتائیں کہ لفظِ ھدی کو نکرہ لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: ویسے تو لفظِ علی استعلاء کے لیے ہوتا ہے لیکن یہاں ان موصوفین کے ہدایت پر تمکن اور استقرار کی مثال دی گئی ہے اس شخص کی حالت کے ساتھ جو کسی شی پر بلند ہو جائے

اور اس پر سوار ہو جائے۔ اور یہ حاصل ہوتا ہے کہ فکر کے استقرار سے اور ہمیشہ اس میں نظر لگانے سے جس میں حجج و دلائل نصب کیے گئے ہیں اور نفس کے عمل میں محاسبہ پر ہیشگی کرنے سے۔

ھدی کو نکرہ تعظیم کے لیے لایا گیا گویا اس سے ہدایت کی وہ قسم مراد ہے، جس کی حقیقت تک نہیں پہنچا جا سکتا اور نہ ہی اس کی قدر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سوال نمبر ۷۰: اولئك هم الفلحون میں اسم اشارہ کا تکرار کس بات پر اور کیسے تنبیہ قرار پاتا ہے نیز واؤ حرف عطف لانے کی وجہ کیا ہے جب کہ اولئك كالانعام بل هم اضل اولئك هم الغفلون میں حرف عطف نہیں لایا گیا؟

جواب: اس میں اسم اشارہ کا تکرار اس بات پر تنبیہ کے لیے ہے کہ ان کا ان صفات کے ساتھ اتصاف تقاضا کرتا ہے ان دونوں نتیجوں میں سے ہر ایک کا اور ان میں سے ہر ایک (اولئك على هدى من ربهم و اولئك هم المفلحون) کافی ہے ان کے باقیوں سے ممتاز ہونے میں۔

وجہ تنبیہ: کیونکہ ماقبل یہ گزر چکا ہے کہ حکم کا مرتب ہونا اسم اشارہ پر یہ اس طرح ہے جس طرح کہ وہ موصوف مترتب ہوا تو اس نے اشارہ کیا اس بات کی طرف کہ موصوف کا ان صفات سے موصوف ہونا ایسی علت ہے جو ان میں سے ایک کا تقاضا کرنے والی ہے کیونکہ تکریر علت تکریر معلول پر دلالت کرتی ہے اگر اسم اشارہ کا تکرار نہ ہوتا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ اوصاف معطوف علیہ (علی هدى) کا تقاضا کرتے ہیں نہ کہ معطوف (المفلحون) کا اور اسم اشارہ کے تکرار سے اس بات پر تنبیہ ہوگئی کہ یہ اوصاف معطوف کا بھی تقاضا کرتے ہیں۔
دوسری تنبیہ اس طرح حاصل ہوئی کہ ان دونوں فصلوں میں سے ہر ایک ان کے ممتاز ہونے میں کافی ہے اگر اسم اشارہ کا تکرار نہ ہوتا تو یہ سمجھا جاتا کہ ان کا مجموعہ تو ممتاز کرنے کے لیے

کافی ہے الگ الگ نہیں۔

سوال نمبر ۱۰۸: ھم ضمیر لانے کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں ان کو واضح کریں اور بتائیں کہ فلاح کا کیا معنی ہے اور متقین کو مفلحون کیوں کہا گیا؟

جواب: ھم ضمیر مبتدا ہے اور المفلحون اس کی خبر ہے اور یہ جملہ اولئک کی خبر ہے۔ فلاح کا معنی الفائز بالمطلوب ہے متقین کو مفلحون۔ اس لیے کہا گیا کہ ان کے لیے بھی کامیابی کے راستے کھل جاتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۰۹: مصنف علیہ الرحمۃ نے سعادتوں کے حصول کے سلسلے میں متقین کے اختصاص کی کچھ وجوہ بیان کی ہیں ان وجوہ کا جائزہ پیش کریں؟

جواب: متقین کے اختصاص کی مصنف نے چند وجوہ بیان کی ہیں جن کا جائزہ پیش خدمت ہے۔

(۱) کلام کو اسم اشارہ پر مبنی کرنا تعلیل مع الایجاز ہے (کیونکہ اس میں صفات داخل ہیں اور یہ بمنزلہ مشتق کے ہے جو کہ مفید علت ہے نیز اس میں اختصار ہے اگر اسم اشارہ نہ ہوتا تو تمام صفات کو ذکر کرنا ضروری ہوتا)

(۲) اسم اشارہ کی تکریر، خبر کی تعریف، فصل کی توسیط ان کی قدر کے اظہار کے لیے ہے۔ اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی رغبت دینا ہے۔

سوال نمبر ۱۱۰: ان الذین کفروا کے شروع میں واؤ عاطفہ کیوں نہیں لائی گئی جس طرح ان الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم میں واؤ عاطفہ لائی گئی ہے؟

جواب: جواب سے پہلے ایک تمہید ہے کہ حرف عطف ان دو جملوں کے درمیان لایا جاتا ہے جن میں مکمل مغایرت وانقطاع نہ ہو اور جہاں مکمل مغایرت وانقطاع ہو وہاں حرف عطف نہیں لایا جاتا۔ اس تمہید کے بعد جواب یہ ہے کہ ان الذین کفروا اور پہلے جملے میں

تباین فی الغرض ہے کیونکہ پہلا جملہ قرآنِ کریم کے ذکر اور اسکی شان بیان کرنے کے لیے چلایا گیا جب کہ دوسرا جملہ کفار کی سرکشی اور گمراہی میں ان کے انہماک کی شرح کے لیے چلایا گیا۔ بخلاف ان الابرار لفی کے کیونکہ پہلے جملے کا مسند الیہ (الابرار) دوسرے جملے کے مسند (جحیم) کی ضد ہے اور بلغاء تضاد کو جامع وہمی کے قبیلہ سے شمار کرتے ہیں جو کہ دو جملوں کے درمیان وجوہ مناسبت میں سے ایک وجہ ہے تو جب دونوں جملوں میں ایک قسم کی مناسبت ہوئی تو کمالِ مغایرت نہ رہی اسی وجہ سے حرفِ عطف لایا گیا۔

سوال نمبر ۱۱۱: انّ حروف مشبہ بالفعل میں سے ہے اس مشابہت کی صورتیں کون کونسی ہیں۔ نیز فعل رفع بھی دیتا ہے اور نصب بھی اسی طرح ان کا بھی یہ عمل ہے تو دونوں کے عمل میں فرق کیا ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: حروف مشبہ بالفعل کی فعل کے ساتھ مشابہت کی صورتیں درج ذیل ہیں۔

(۱) تعدادِ حروف میں مشابہت (۲) فتح پر مبنی ہونے میں مشابہت۔

(۳) لزومِ اسماء میں مشابہت یعنی جس طرح فعل کے بعد اسم لازم ہے۔ اسی طرح ان حروف کے بعد بھی اسم لازم ہے۔

(۴) فعل کے معانی دینے میں مشابہت۔

(۵) یہ حروف فعلِ متعدی کے ساتھ مشابہ ہوتے ہیں اس بات میں کہ جس طرح فعل متعدی دو اسموں پر آتا ہے اسی طرح یہ حروف بھی دو اسموں پر داخل ہوتے ہیں۔ (حروف مشبہ بالفعل کی فعل کے ساتھ مشابہت کی مثال پہلی چار وجہوں میں یہ ہے کہ جس طرح حَقَّ ماضی کا صیغہ سے حروف کی تعداد انّ کے حروف کے مساوی ہے اور یہ فتح پر مبنی ہے اور اسکے بعد اسم لازم ہے جو کہ فاعل بنے گا نیز ان میں حق والا معنی بھی پایا جاتا ہے باقی حروف مشبہ بالفعل کو اسی طرح باقی افعال پر قیاس کرلیا جائے)

دونوں کے عمل میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ (یعنی جس طرح فعل رفع ونصب دیتا ہے اسی طرح یہ بھی دیتے ہیں لیکن فعل پہلے اسم کو رفع اور دوسرے کو نصب دیتا ہے جب کہ یہ حروف پہلے کو نصب اور دوسرے کو رفع دیتے ہیں) اس بات پر آگاہی ہو جائے کہ یہ حروف عمل میں فعل کی فرع ہیں اور آمیں داخل ہیں۔

سوال نمبر۱۱۲: اِنَّ لانے کا کیا فائدہ ہے اور یہ کہاں کہاں آتا ہے مثال سے واضح کریں؟

جواب: اِنَّ لانے کا فائدہ اس نسبت کو جو مبتدا اور خبر کے درمیان ہوتی ہے پکا کرنا ہے۔ اور اِنَّ شک کی جگہوں میں لایا جاتا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو فرمایا انــــــی رسـول مـنّ رب الـعــالـمین تو فرعون کو آپ کی رسالت میں شک تھا اس لیے اِنّ لائے۔

اور کبھی یہ جواب قسم کے شروع میں آتا ہے اور مطلقاً جواب کے شروع میں بھی آتا ہے جیسے قـولـه تـعالیٰ ویسئلونك عن ذی القرنین قل سأتلوا علیکم منه ذکرا انا مکنا له فی الارض تو یہاں ان کے سوال کے جواب میں اِنَّا لایا گیا۔ (نیز امام مبرد نے فرمایا جب عبد اللّٰه قائم بغیر ان کے کہا جائے تو یہ عبداللہ کے قیام کی خبر ہے اور اگر ان عبـد اللّٰه قــائـم کہا جائے تو یہ سائل کا جواب ہوگا کیونکہ یہ انّ کے ساتھ ہے اور ان عبد اللّٰه لقائم عبداللہ کے قیام کے منکر کا جواب ہے کیونکہ اس میں دو تاکیدیں ہیں)

سوال نمبر۱۱۳: اسم موصول کی تعریف عہد یا جنس کے لیے ہے دونوں صورتوں میں واضح کریں کہ کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: الف لام عہدی ہونے کی صورت میں معین لوگ مراد ہوں گے جس طرح ابولہب، ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور علماء یہود اور الف لام جنسی مراد لینے کی صورت میں وہ تمام لوگ مراد

ہوں گے جو کفر پر پختہ ہوئے اور ان کے علاوہ باقی کافر بھی مراد ہوں گے یعنی جو کفر پر پختہ نہ ہوئے پھر سواء علیھم الایۃ سے غیر مصرین کو خارج کر دیا گیا اور صرف مصرین علی الکفر اس میں داخل رہے۔

سوال نمبر ۱۱۴: کفر کا لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کریں؟

جواب: کفر کا لغوی معنی ستر النعمۃ ہے (نعمت کو چھپانا) اور اصطلاح شرع میں اس چیز کے انکار کرنے کو کفر کہتے ہیں جس کے بارے میں بداھتاً معلوم ہو کہ رسول کریم ﷺ اس کو لائے ہیں۔

سوال نمبر ۱۱۵: قرآن مجید میں جو الفاظ ماضی کے صیغے کے ساتھ آئے ہیں ان کے حوالے سے معتزلہ کا اختلاف اور ان کے استدلال کا جواب وضاحت سے ذکر کریں؟

جواب: معتزلہ کا اہل سنت وجماعت سے اختلاف یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کو حادث مانتے ہیں اور اس کے حدوث پر استدلال اس طرح کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں ماضی کے صیغے کے ساتھ اخبار کثرت سے موجود ہے مثلاً ان الذین کفروا اور اسی طرح دوسری آیات' اور ماضی کا لفظ یہ تقاضا کرتا ہے کہ خبر دینے سے پہلے نسبت واقع ہو چکی ہو نزول قرآن کے وقت ماضی کے صیغے سے اخبار اس کا تقاضا کرتا ہے کہ اخبار وقوع نسبت سے مسبوق ہو لہذا یہ مسبوق بغیرہ ہوا اور ہر مسبوق بغیرہ مسبوق بالعدم ہوتا ہے لہذا مسبوق بالعدم بھی ہوا اور جو مسبوق بالعدم ہو وہ حادث ہوتا ہے لہذا قرآن کریم بھی حادث ہوا۔

معتزلہ کو جواب اس طرح دیا گیا کہ ہمارا مذہب جو یہ ہے کہ قرآن کریم ازلی ہے تو اس سے مراد کلامِ نفسی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور (ازل میں) یہ ماضی حال و مستقبل کے ساتھ متصف نہیں تھا۔ کیونکہ ازل میں زمانہ نہ تھا البتہ یہ کلام ماضی وغیرہ سے متصف ہوتا ہے تعلقات کے تجدد کے ساتھ اور زمانوں کے حادث ہونے کے

ساتھ۔ تو زیادہ سے زیادہ حدوثِ تعلق لازم آئے گا جو کہ حدوثِ کلام کا مقتضی نہیں جس طرح کہ علم میں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں اس بات کا علم تھا کہ عالم موجود ہوگا اب جب عالم وجود میں آیا تو اللہ تعالیٰ کا علم کہ عالم موجود ہوگا (سیوجد) وُجِدَ میں منقلب ہوگیا کہ عالم موجود ہوگیا اب عالم کے ساتھ علم کے تعلق کے حدوث سے اللہ تعالیٰ کے علم کا حادث ہونا لازم نہیں آتا۔

سوال نمبر ۱۶: لفظِ سواء اور اس کے اعراب کی تحقیق کے حوالے سے مصنف نے جو کچھ ذکر کیا ہے واضح الفاظ میں بیان کریں؟

جواب: لفظِ سواء اسم ہے استواء کے معنی میں ہے تو جس طرح مصدر کے ساتھ صفت لائی جاتی ہے اسی طرح سواء کے ساتھ صفت لائی گئی۔ اور سواء ان کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کا مابعد علیھم ء انذرتھم الخ) اس کا فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اب تقدیر عبارت یوں ہو گی ان الذین کفروا مستو علیھم انذارك وعدمہ سیئان علیھم یہاں سواء صفت کے معنی میں اور ء انذرتھم ام لم تنذرھم یہ مصدر کے معنی میں ہو کر صیغہ صفت کے فاعل بن جائیں گے۔

سوال نمبر ۱۷: والفعل انما یمتنع الاخبار عنه الخ اس عبارت میں ایک سوال کا جواب ہے۔ سوال اور جواب کی وضاحت مطلوب ہے؟

جواب: مفسر نے پہلے فرمایا تھا کہ انذرتھم ام لم تنذرھم یا تو سواء کا فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یا مخبر عنہ ہوگا (یعنی سواء خبر مقدم اور ء انذرتھم ام لم تنذرھم مبتدا مؤخر ہوگی) اس پر اعتراض ہوا کہ مخبر عنہ مسند الیہ ہمیشہ اسم ہوتے ہیں جب کہ فعل کا مسند الیہ ہونا ممتنع ہے تو آپ نے ء انذرتھم الخ کو کس طرح مسند الیہ بنا دیا حالانکہ یہ فعل ہے۔

مفسر علیہ الرحمۃ نے اس اعتراض کا جواب دیا کہ فعل کو مخبر عنہ بنانا تب ممتنع ہوتا ہے جب فعل سے تمام ماوضع لہ مراد ہو (جس کے لیے فعل وضع کیا گیا ہے وہ تمام کا تمام مراد ہو) (اور فعل تین چیزوں کے لیے وضع کیا گیا۔

(۱) معنیٰ مصدری (۲) نسبت معنی مصدری اور فاعل کے درمیان نسبت۔ (۳) زمانہ

جب فعل سے اس کا لفظ مراد ہو یا مطلق حدوث مراد ہو تو فعل اضافت اور مسند الیہ ہونے میں اسم کی طرح ہوتا ہے لہذا اس صورت میں فعل کو مخبر عنہ بنانا درست ہے۔

سوال نمبر ۱۱۸: قرآن مجید میں ء انذرتھم بطور فعل لانے اور مصدر نہ لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: اس میں دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) معنوی (۲) لفظی

معنوی فائدہ تو یہ ہے کہ فعل لانے میں ایہام تجدد ہے کیونکہ فعل کے مفہوم میں زمانہ بھی داخل ہے اور زمانے کی شان تغیر وتجدد ہے جب کہ مصدر لانے میں یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔

لفظی فائدہ یہ ہے کہ ہمزہ اور ام کا فعل پر دخول تو حسن ہے مصدر پر دخول حسن نہیں کیونکہ استفہام بالفعل اولیٰ ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۱۱۹: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انذار کا ذکر فرمایا اور بشارت کا ذکر نہیں فرمایا اس کی کیا وجہ ہے نیز ء انــذرتھــم کے دو ہمزوں کے بارے میں مفسر علیہ الرحمۃ نے کیا فرمایا ہے؟

جواب: اس لیے کہ انذار دل میں زیادہ واقع ہوتا ہے اور نفس میں زیادہ تاثیر کرتا ہے کیونکہ ضرر کو دور کرنا نفع حاصل کرنے سے اہم ہے نیز جب کفار کو انذار نے نفع نہ دیا حالانکہ اس

میں تاثیر زیادہ ہے تو بشارت بطریق اولیٰ نفع نہ دے گی کیونکہ یہ تاثیر میں انذار سے کم ہے اسی لیے بشارت کا ذکر نہ فرمایا گیا۔

(۱) ءانذرتهم کے دو ہمزوں کے بارے میں مفسر نے فرمایا کہ ان دونوں کو تحقیق (اپنے مخرج) سے پڑھا گیا ہے۔

(۲) اور دوسرے ہمزہ کی تخفیف کے ساتھ (تحقیق اور تخفیف دونوں کے درمیان میں الف داخل نہیں کیا جاتا) اور تخفیف ثانیہ کی صورت میں دوسرے ہمزہ کو الف اور ہمزہ کے درمیان پڑھا گیا ہے یعنی ان کے مخارج کے درمیان لیکن دوسرے ہمزہ کو الف سے بدلنا لحن جلی ہے اس لیے کہ متحرک ہمزہ کو الف سے نہیں بدلا جاتا نیز اس سے اجتماع ساکین (الف اور نون) علی غیر حدہ لازم آتا ہے جو کہ ممنوع ہے (یہ اجتماع ساکنین علی غیر حدہ اس لیے ہے کہ دوسرا ساکن غیر مدغم ہے)۔

(۳) دو ہمزوں کو تحقیق سے ہی پڑھا جائے لیکن درمیان میں الف داخل کر دیا جائے۔

(۴) درمیان میں الف داخل کیا جائے اور دوسرے ہمزہ کو بین بین پڑھا جائے۔

(۵) ہمزہ استفہام کو حذف کر دیا جائے۔

(۶) ہمزہ استفہام کو حذف کر دیا جائے اور اس کی حرکت اس سے پہلے ساکن (جو کہ علیهم کی میم ہے) اس کو دے دی جائے اور عَلَيْهِمُ أَنْذَرْتَهُمْ پڑھا جائے۔

سوال نمبر ۱۲۰: جملہ لا یؤمنون ترکیب میں کیا واقع ہوتا ہے تفصیلی جواب دیں؟

جواب: اس کی چند صورتیں ہیں:

(۱) یہ جملہ ماقبل کی تفسیر کرے (جس میں استواء تھا اور وہ ءانذرتهم الخ ہے) اس صورت میں اس کا محل اعراب نہ ہوگا۔

(۲) یہ حال مؤکدہ ہو (علیھم کی ضمیر سے)

(۳) یہ بدل ہو (اِن کی خبر سے جو کہ سواء الخ ہے)

(۴) یہ ان کی خبر ہو اور ماقبل (سواء الخ) جملہ معترضہ ہو جو کہ حکم کی علت ہے۔

سوال نمبر ۱۲۱: تکلیف مالا یطاق کے جواز اور عدم جواز کے حوالے سے اختلاف، مجوزین کا اس آیت سے استدلال اور اس کا جواب وضاحت سے تحریر کریں؟

جواب: جمہور محققین کے نزدیک تکلیف مالا یطاق (جس کو ممتنع لذاتہ کی تکلیف سے بھی تعبیر کرتے ہیں) جائز نہیں اور امام اشعری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جائز تو ہے واقع نہیں (جس طرح اجتماع ضدین)

اس آیہ مبارکہ سے جنہوں نے تکلیف مالا یطاق کے جواز پر استدلال کیا وہ اس طرح کیا کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کا مکلّف بھی بنایا ہے اب اگر وہ ایمان لے آئیں تو دو محال لازم آئیں گے۔ پہلا تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی خبر (لا یؤمنون) کاذب ہو جائے گی اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا اس سے معاذ اللہ جہل لازم آئے گا اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں محال ہیں اور جس کے وقوع کا فرض محال ہو وہ خود بھی محال ہوتا ہے لہذا ان سے ایمان کا صدور محال ہوا حالانکہ ان کو ایمان کا مکلّف بنایا گیا اور یہ تکلیف بالمحال ہے اور اس چیز کی تکلیف ہے جس کی طاقت نہ ہو لہذا ثابت ہو گیا کہ تکلیف مالا یطاق جائز ہے۔ بلکہ واقع بھی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ان کو مکلّف بنایا اور ایمان کہتے ہیں تصدیق النبی ﷺ فی جمیع ما علم مجیئہ بہ اور اس میں سے لا یؤمنون بھی ہے اب ان کا ایمان لا یؤمنون کے ایمان کو بھی شامل ہو گیا اور یہ ضدین کا اجتماع ہے جو کہ محال ہے۔ لہذا ان کو ایمان کا مکلّف بنانا تکلیف مالا یطاق ہے۔

والحق الخ سے مفسر علیہ نے مجوزین کا جواب دیا کہ تکلیف مالا یطاق اگرچہ عقلا جائز ہے (کیونکہ احکام غرض کا تقاضا نہیں کرتے) لیکن یہ غیر واقع ہے اور رہی بات آپ کے استدلال کی تو شے کے واقع ہونے یا واقع نہ ہونے کی خبر دینا اس شے پر قدرت کی نفی نہیں کرتا لہذا یہ تکلیف ممتنع لذاتہ نہ ہوئی اور آپ کا تکلیف بالممتنع لذاتہ کے جواز پر اس آیت سے استدلال کرنا درست نہ ہوا۔

سوال نمبر ۱۳۲: جب یہ بات معلوم ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے تو انذار کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کچھ دیگر آیات کے حوالے سے اپنے جواب کو مدلل ذکر کریں۔ نیز یہ بتائیں کہ کیا اس آیت میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو غیب کی خبر دی گئی یا نہیں اگر غیب کی خبر ہے تو کس صورت میں؟

جواب: لایؤمنون کے علم کے باوجود انذار کے فوائد ہیں۔

(۱) اتمام حجت۔

(۲) تبلیغ کے فعل سے رسول اکرم ﷺ کا ثواب و فضل حاصل کرنا۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سواء علیھم فرمایا کہ انذار اور عدم انذار کفار پر برابر ہیں سواء علیك نہیں فرمایا کیونکہ آپ ﷺ کو اس انذار کا نفع ہے۔ اور جب کہ بتوں کے پجاریوں کے حق میں فرمایا سوء علیکم ادعوتموھم الایة کہ تم پر برابر ہے کہ بتوں کو پکارو یا خاموش رہو یعنی تمہیں اس کا کوئی نفع نہیں ہوگا۔

الذین موصول میں اگر الف لام عہد خارجی کا مراد ہو تو اس سے معین لوگ مراد ہوں گے کما ذکر اور یہ خبر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو دی گئی (کیونکہ کسی کے بارے میں حواس کے ذریعے یہ نہیں جانا جا سکتا ہے کہ وہ ایمان لائے گا یا نہیں اس لیے ابو جہل، ابو لہب وغیرہ کے ایمان نہ لانے کی خبر غیب ہے)

سوال نمبر۱۲۳: ختم اور غشاوۃ کی وضاحت کریں اور یہاں ان دونوں سے کیا مراد ہے اس پر تفصیلی جواب لکھیں؟

جواب: ختم 'کتم (چھپانے) کو کہتے ہیں اور غشاوۃ ڈھانپنے کو کہتے ہیں آیہ کریمہ میں ختم اور غشاوہ اپنے حقیقی معانی پر استعمال نہیں ہوئے بلکہ یہاں ان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ایسی ہیئت پیدا فرمادے جو ان کو کفر کے پسند کرنے اور ایمان کو ناپسند کرنے پر نیز گناہوں کو پسند کرنے پر اور نیکیوں کو ناپسند کرنے پر عادی بنادے اور وہ ہیئت ان کے دلوں کو ایسا بنادے کہ اس میں حق داخل نہ ہو سکے (ان کی سرکشی کے سبب نیز گمراہوں کی تقلید میں منہمک ہونے اور نظر صحیح نہ کرنے کے سبب) تو گویا ایسے ہو گئے جن پر مہر لگی ہوئی ہے اور وہ ان کی آنکھیں انفسی و آفاقی دلائل کو نہیں دیکھتیں گویا کہ ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان آیات اور آنکھوں کے درمیان حائل ہو گئے ہیں تو اس کو ختم اور غشاوۃ بطور استعارہ فرمایا گیا۔

یا بطور استعارہ تمثیلیہ ان کے دلوں اور ان کے اعضاء کی جو کہ ناکارہ ہو چکے ہیں' مثال ان اشیاء کے ساتھ جن اشیاء اور ان سے انتفاع کے درمیان پردہ حائل ہے ختم اور غشاوۃ کے ساتھ دی گئی۔

سوال نمبر۱۲۴: واضطربت المعتزلة فيه فذكروا وجوها من التاويل. اس عبارت کی روشنی میں یہ بتائیں کے معتزلہ کے اضطراب کی کیا وجہ ہے اور اس کی انہوں نے کیا کیا تاویلات کی ہیں؟

جواب: معتزلہ کے اضطراب کی وجہ یہ ہے کہ ختم الله علی قلوبهم الاية سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگانے کے ساتھ قبول حق سے مانع ہوا اور ان کے کانوں پر مہر لگانے کے ساتھ حق تک پہنچنے سے مانع ہوا اور حق سے مانع ہونا قبیح ہے لہذا اللہ

تعالیٰ سے اس کا صدور ممتنع ہوا۔

وجوہ تاویل:

(۱) کفار نے جب حق سے اعراض کیا اور یہ اعراض ان کے دلوں میں راسخ ہوگیا یہاں تک یہ ان کی طبیعت کی طرح ہوگیا تو ان کی تشبیہ اس وصف کے ساتھ دی گئی جو خلقی ہے اور جس پر ان کی فطرت رکھی گئی ہے۔

(۲) آیت ختم اللہ الایۃ سے مراد ان کے دلوں کی حالت کی مثال دینا ہے چوپائیوں کے دلوں کے ساتھ کہ چوپائیوں کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت وفطانت سے خالی پیدا فرمایا ہے تو یہ بھی ذہانت وفطانت سے خالی ہیں یا یہ کہ دلوں کو یہ فرض کیا گیا ہے کہ ان پر مہر لگی ہوئی ہے اور ان کا خارج میں کوئی وجود نہیں صرف فرض کرنے کی حد تک ہے۔

(۳) حقیقت میں تو یہ فعل (ختم) شیطان یا کافر کا فعل ہے لیکن جب ان سے اس فعل کا صدور اللہ تعالیٰ کے ان کو قدرت دینے سے ہے تو اس فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف مجازاً کر دی گئی یعنی مُسبِّب کی طرف۔

(۴) کفار کے اندر جب کفر پختہ وراسخ ہوگیا تو ایمان حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہ رہا سوائے اس کے کہ ان کو ایمان کی طرف مجبور کیا جائے۔ لیکن پھر ان کو ایمان پر مجبور نہیں کیا تو اس ترکِ الجاء وجبر کو ختم سے تعبیر کر دیا گیا کیونکہ تکلیف اس آدمی کو دی جاتی ہے جو مختار ہو اور جو مجبور ہو اسے مکلف نہیں بنایا جاتا تو غرضِ تکلیف کو باقی رکھتے ہوئے ترکِ الجاء وجبر کیا گیا۔

(۵) کفار یہ کہتے تھے کہ ہمارے دل پردے میں ہیں اس سے جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے اور ہمارے اور آپ کے

درمیان پردہ ہے تو ختم اللہ الایۃ میں اسی کی حکایت کی گئی بطور تہکم واستہزاء جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔

(۶) یہ ختم آخرت میں ہوگا اور ماضی سے اسے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ اس کا وقوع یقینی ہے۔ جس طرح کہ ونحشرھم یوم القیامۃ علی وجوھھم عمیا وبکما وصما سے بھی اس تاویل کی تائید ہوتی ہے کہ اس آیۂ مبارکہ میں نحشرھم یوم القیامۃ فرمایا گیا کہ قیامت کے دن ان کو اندھا، گونگا اور بہرہ کر کے جمع کیا جائے گا۔

(۷) ختم سے مراد (بطور استعارہ) ان کے دلوں کی علامت ہے جسے فرشتے پہچان کر ان سے نفرت کریں گے۔

سوال نمبر ۱۲۵: گذشتہ سوال میں معتزلہ کے جس اضطراب کا ذکر ہے اس سلسلے میں اہل سنت وجماعت کا موقف کیا ہے اور مصنف نے جو یہ فرمایا کہ وعلی ھذا المنھاج کلا منا وکلامھم فیما یضاف الی اللّٰہ تعالیٰ من طبع واضلال، اس منہاج کی وضاحت کیجئے؟

جواب: اھل سنت وجماعت کا موقف یہ ہے کہ ختم اس مقام پر اس معنی میں ہے کہ ایسی ہیئت کو پیدا کر دیا جائے جو قبول حق سے مانع ہو (کفار کی سرکشی کے باعث) اور اس کی اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف اس حیثیت سے ہے کہ تمام کے تمام ممکنات کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور یہ اسکی قدرت سے واقع ہوتے ہیں۔

وعلی ھذا المنھاج الخ سے مراد یہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ اور جتنی بھی اس قسم کی آیات ہیں جن میں طبع، اور اضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے ان میں ہمارا طریقہ وہی ہوگا جو ابھی ہم نے بیان کیا (کہ طبع واضلال کا معنی احداث ھیئۃ الخ) ہے

اور معتزلہ کا طریقہ وہی سات تاویلات ہوں گی جو پہلے مذکور ہوئیں۔

سوال نمبر ۱۲۶: دلوں اور کانوں پر مہر اور آنکھوں پر پردہ اس فرق کی وجہ کیا ہے نیز یہ بتائیں کہ حرف جار کا تکرار کس وجہ سے ہے اور سمع کو واحد اور قلوب وابصار کو جمع کیوں لایا گیا؟

جواب: دل اور سمع تمام اطراف سے ادراک کرتے ہیں اس لیے ان کے لیے ختم کا ذکر فرمایا گیا جو تمام جہات و اطراف سے ادراک کے لیے مانع ہے اور آنکھوں کا ادراک صرف سامنے کی طرف سے ہوتا ہے لہذا اس کے لیے غشاوۃ کا لفظ استعمال کیا گیا کیونکہ یہ بھی صرف سامنے کی جہت سے ادراک کو مانع ہوتا ہے ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم میں حرف جر کا تکرار اس وجہ سے ہے تاکہ یہ دونوں جگہوں میں ختم کی شدت پر دلالت کریں نیز ان میں سے ہر ایک حکم میں مستقل ہو۔

سمع کو واحد اور ابصار وقلوب کو جمع لانے میں چند وجوہ ہیں:

(۱) سمع ضمیر جمع کی طرف مضاف ہے اور ظاہر ہے کہ جماعت کا ایک کان نہیں ہوتا اس التباس سے امن کی وجہ سے سمع کو واحد لایا گیا۔

(۲) اصل کا اعتبار کرتے ہوئے کیونکہ سمع اصل میں مصدر ہے اور مصادر کی جمع نہیں آتی اس لیے یہاں بھی سمع کو جمع نہیں لایا گیا۔

(۳) یہاں مضاف مقدر ہوگا جیسے علی حواس سمعھم (اس صورت میں سمع مصدر کے معنی میں ہوگا عضو کے معنی میں نہیں)

بخلاف ابصار وقلوب کے ان میں یہ وجوہ نہیں پائی جاتیں۔

سوال نمبر ۱۲۷: لفظ عذاب کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق پیش کریں نیز یہ بتائیں کہ عظیم اور کبیر میں کیا فرق ہے اور ان دونوں کی نقیض کیا ہے اور یہ بھی بتائیں کہ غشاوۃ کو نکرہ کیوں لایا گیا؟

جواب: عذاب' نکال کی طرح ہے بناء اور معنی دونوں کے اعتبار سے جس طرح کہ عذب عن الشیء ونکل عنه تب کہا جاتا ہے جب کوئی رک جائے پھر عذاب میں وسعت پیدا کر دی گئی اور یہ ہر الم قادح (مشکل بھاری) پر بولا جانے لگا چاہے وہ نکال (عقاب) ہو یا نہ ہو لہذا عذاب' نکال اور عقاب سے اعم ہے کیونکہ عقاب و نکال عبارۃ ہیں اس الم سے جو جنایت کرنے والے کو دوبارہ جنایت نہ کرنے دے بعض نے یہ کہا کہ عذاب تعذیب سے مشتق ہے جس کا معنی مٹھاس کو زائل کرنا ہے۔

عظیم' کبیر سے اوپر ہے۔ اور عظیم حقیر کی نقیض ہے اور کبیر صغیر کی نقیض ہے۔

آیت کریمہ میں غشاوۃ اور عذاب کو اس لیے نکرہ لایا گیا کہ غشاوۃ سے تو ایسا پردہ مراد ہے جس کو لوگ نہیں جانتے اور وہ آیات سے اندھا ہونا ہے اور عذاب کو نکرہ اس لیے لایا گیا کہ ان کے آلام و مصائب کی ایسی نوع ہے جس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

سوال نمبر ۱۲۸: منافقین کا ذکر مؤمنین اور کفار کے ذکر کے مقابلے میں طویل کیوں ہے نیز جن تین فرقوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی تقسیم کس انداز میں کی گئی ہے؟

جواب: منافقین کے ذکر کی طوالت اس وجہ سے ہے کہ یہ خبیث ترین کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ترین ہیں نیز انہوں نے کفر پر ایمان کی ملمع سازی کی اور کفر و ایمان کو خلط ملط کیا دھوکہ دینے کے لیے۔

تین فرقوں کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے کتاب عظیم کی حالت کی شرح کا آغاز فرمایا اور اس کے بیان کے لیے ان مؤمنین کا ذکر فرمایا جنہوں نے اپنے دین کو خالص اللہ تعالیٰ کے بنایا اور ان کے دل ان کی زبانوں کے موافق ہیں اور پھر ان کی ضدوں کا ذکر کیا جو محض کافر ہیں تو تیسرے نمبر پر تیسری قسم کا ذکر فرمایا جو پہلی دو قسموں کے درمیان

مذہب ہے۔

سوال نمبر۱۲۹: الناس کی اصل کیا ہے اور انسان کو انسان کہنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: الناس کی اصل أناس ہے (پھر ہمزہ کو حذف کر کے اس کی جگہ الف لام تعریف لے آئے الناس ہو گیا) انسان کو انسان اس لیے کہتے ہیں کہ یہ أنس سے ماخوذ ہے انسان بھی اپنے امثال سے اُنس محسوس کرتے ہیں اس لیے انہیں انسان کہا جاتا ہے یا یہ أنَسَ سے ماخوذ ہے جس کا معنی دیکھنا ہے تو چونکہ انسان بھی ظاہر ہوتے ہیں دیکھے جاتے ہیں اس لیے انہیں انسان کہا جاتا ہے۔

سوال نمبر۱۳۰: الناس کے الف لام اور لفظِ مِن کے بارے میں تفصیلی جواب لکھیں اور مصنف نے وعلی ھذا تکون الایۃ تقسیما للقسم الثانی' اس عبارت میں کس بات کی طرف اشارہ کیا ہے؟

جواب: الناس میں الف لام یا تو جنس کے لیے ہے اور مِن موصوفہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں معہود کوئی نہیں گویا کہا گیا کہ لوگوں میں سے کچھ لوگ جو کہتے ہیں الخ یا الف لام عہد کا ہوگا اور معہود وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے کفر کیا اور اس صورت میں مَن موصولہ ہوگا اور اس سے ابن اُبَیّ اور اس کے ساتھی اور اس کے امثال مراد ہوں گے۔ (اس حیثیت سے کہ جب وہ نفاق میں پختہ ہو گئے تو ان کفار کی گنتی میں شمار ہو گئے جن دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے)

وعلی ھذا تکون الخ یہاں سے مفسر اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جب الناس پر الف لام عہد کا مانا جائے اور معہود جنس مذکور ہو اور بعض منافقین ان کفار میں سے ہوں تو اب ومن الناس قسم ثانی (وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور کفر پر مصر ہو گئے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی) کی دو قسموں کی طرف تقسیم ہو گی ایک جو محض کافر ہیں

دوسرے جو منافق ہیں۔

سوال نمبر ۱۳۱: ایمان میں کئی امور داخل ہیں اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) ایمان سے مقصود اعظم جو ہے اس کو ذکر میں خاص کیا گیا۔

(۲) منافقین کا یہ دعویٰ تھا کہ ہم نے ایمان کی دونوں طرفوں (اللہ تعالیٰ پر ایمان اور یوم آخرت پر ایمان) کا احاطہ کرلیا ہے۔

(۳) یہ بتانا مقصود ہے کہ منافقین کا جس پر ایمان لانے میں اخلاص کا دعویٰ تھا اس میں وہ منافق ہیں تو جس میں نفاق کا قصد کرتے تھے (یعنی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے میں) اس میں ان کی منافقت کی انتہاء کا کیا کہنا۔

سوال نمبر ۱۳۲: حرف باء کا تکرار کس وجہ سے ہے اور مَنْ یَقُوْلُ کے حوالے سے قول کے بارے میں مفسر نے کیا وضاحت کی ہے؟

جواب: حرف باء کے تکرار میں وہ اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ان میں سے ہر ایک پر اصالۃً ایمان رکھتے ہیں اور پختہ ایمان رکھتے ہیں قول کی تفسیر میں چند وجوہ ہیں۔

(۱) مفید شے کا تلفظ کرنا (چاہے مفرد ہو یا مرکب) یعنی وہ مہمل شے نہ ہو۔

(۲) مقول کے معنی میں بھی قول کا اطلاق ہوتا ہے یعنی جو کچھ کہا جائے (مفید ہو یا غیر مفید)

(۳) قول اس معنی کو کہا جاتا ہے جو نفس میں متصور ہو جس کو لفظ سے تعبیر کیا جائے۔

(۴) رائے اور مذہب کو قول کہا جاتا ہے۔

نوٹ: مشہور بات یہ ہے کہ قول ایسے مرکب کے ساتھ تلفظ کرنے کو کہتے ہیں جو نسبت اسنادیہ پر دلالت کرے پھر مجازاً ان معانی پر اس کا اطلاق ہونے لگا جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے مثلاً لفظ قول وغیرہ۔

سوال نمبر۱۳۳: وما هم بمؤمنين فرمانے کی بجائے وما امنوا کیوں نہیں فرمایا گیا حالانکہ یہ الفاظ ان کے قول کے مطابق ہیں کیونکہ وہاں اٰمَنّا فعل ذکر کیا گیا ہے؟

جواب: اس میں حکمت یہ ہے کہ اس طریقے کے ساتھ فرمانے سے تکذیب میں تاکید اور مبالغہ پایا جاتا ہے وہ اس طرح کہ منافقین کو مومنین سے خارج کر دینا زیادہ بلیغ ہے زمانہ ماضی میں ان سے ایمان کی نفی سے یہی وجہ ہے کہ ایمان کی نفی کو باء کے ساتھ مؤکد فرمایا گیا اور ایمان کو مطلق رکھا گیا (ایمان باللّٰہ وبالیوم الآخرے) اس معنی پر کہ انکا ایمان میں کچھ بھی حصہ نہیں۔

سوال نمبر۱۳۴: والخلاف مع الكرامية في الثاني فلا يقيم حجة عليهم اس عبارت کی وضاحت کیجئے؟

جواب: پہلے مفسر علیہ الرحمۃ نے فرمایا تھا کہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے جو ایمان کا دعوی کرے اس حال میں کہ اس کا دل اس کی زبان کے مخالف ہو اعتقاد میں تو وہ مؤمن نہیں۔ تو اس میں الکرامیہ واہلسنت وجماعت میں اتفاق ہے لیکن اگر کوئی ایمان کا دعوی کرے اس حال میں کہ اس کا دل اس سے خالی ہو جو وہ زبان سے کہہ رہا ہے تو اب ہمارا اور کرامیہ کا اختلاف ہے ہم اسے مومن نہیں سمجھتے جب کہ وہ اسے مؤمن سمجھتے ہیں۔

سوال نمبر۱۳۵: الخدع عربی کا لفظ ہے اس کا لغوی اور اصطلاحی معنی ذکر کریں باب مفاعلہ کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا حالانکہ یہ باب جانبین کو چاہتا ہے نیز یخادعون کا مفعول رسول اللہ ﷺ کی بجائے اللہ تعالیٰ کو کیوں بنایا گیا؟

جواب: خدع کا لغوی معنی اخفاء (چھپانا) ہے اور اصطلاحی معنی یہ ہے کہ اپنے ساتھی کو اس کے خلاف وہم میں ڈالے جسے تو چھپائے ہوئے ہے جو تیرے ساتھی کے نزدیک ناپسندیدہ ہے تاکہ تو اسے پھسلا دے جس میں ہے یا جس کے درپے ہے یعنی اسے اس کے اس مطلوب سے ہٹا دے جو حاصل ہو گیا ہے یا جسے حاصل کرنے کی وہ کوشش کر رہا ہے یہ باب اگرچہ جانبین کو چاہتا ہے لیکن یہاں ان کا خداع اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے ظاہر پر نہیں ہے۔ (کیونکہ دھوکا اس کو دیا جاتا ہے جسے واقعہ کا علم نہ ہو جب کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شی مخفی نہیں ہے)

اللہ عزوجل کو یخادعون کا مفعول بنایا گیا حالانکہ وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو دھوکہ دیتے تھے اس کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) یہاں مضاف محذوف ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی یخادعون رسول اللّٰه ۔

(۲) رسول اکرم ﷺ کا معاملہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے اس حیثیت سے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں کما قال ومن یطع الرسول فقد اطاع اللّٰه ۔

سوال نمبر ۱۳۶: منافقین کی مخادعت کی کیا صورت تھی وضاحت سے لکھیں؟

جواب: منافقین کا فعل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس طرح تھا کہ وہ ایمان تو ظاہر کرتے اور کفر کو چھپاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا فعل ان کے ساتھ اس طرح تھا کہ ان پر مسلمانوں کے احکام جاری فرمائے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اخبث الکفار تھے اور یہ بطور استدراج تھا۔ اور رسول کریم ﷺ اور مومنین کا اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا منافقین کے حال کو چھپا کر اور اسلام کا حکم ان پر جاری کر کے یہ متخادعین کی صورت میں ان کے فعل کی مثل ان کو بدلہ دینے کے لیے تھا۔

سوال نمبر ۱۳۷: وما یخدعون کو مختلف صورتوں میں پڑھا گیا ہے وضاحت کریں اور ان کا

اپنے آپ کو دھوکہ دینے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اس کے پڑھنے کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) وما یخادعون پڑھا گیا ہے (باب مفاعلہ سے)

(۲) وما یخدعون پڑھا گیا (مجرد سے)

(۳) وما یخدّعون (باب تفعیل سے)

(۴) یخدّعون (اصل میں یختدعون از باب افتعال تھا تاء کا فتحہ خاء کو دیا گیا پھر قرب فی المخرج کی وجہ سے تاء کو دال سے بدل دیا گیا اور پھر دال کا دال میں ادغام کر دیا گیا۔

(۵) یخادعون (فعل مجہول) پڑھا گیا اور انفسہم کا نصب نزع الخافض کی وجہ سے ہوگا۔

وما یخادعون کی قراءت کی صورت میں ان کا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ دھوکے کا وبال انہی پر لوٹتا ہے اور دھوکے کا ضرر انہی کا احاطہ کرتا ہے۔

سوال نمبر ۱۳۸: نفس کسے کہتے ہیں اور یہاں اس سے کیا مراد ہے نیز شعور کسے کہتے ہیں اور مشاعر سے کیا مراد ہے؟

جواب: شے کی ذات اور اس کی حقیقت کو نفس کہا جاتا ہے پھر روح کو بھی نفس کہہ دیا جاتا ہے (کہ زندہ کا نفس روح سے ہی ہوتا ہے) اور قلب کو بھی نفس کہا جاتا ہے کیونکہ یہ محلِ روح ہے اور خون کو بھی روح کہا جاتا ہے اس لیے کہ خون کا قوام روح سے ہوتا ہے اور رائے کو بھی نفس کہا جاتا ہے اور یہاں نفس سے مراد ان کی ذات ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کی ارواح اور آراء پر محمول کیا جائے۔

شعور احساس کو کہتے ہیں اور مشاعر سے انسان کے حواس مراد ہیں۔

سوال نمبر ۱۳۹: مرض کا حقیقی اور مجازی معنی ذکر کریں اور منافقین کے مرض بڑھنے سے کیا مراد ہے اور اس کی کیا صورت ہے؟

جواب: مرض کا حقیقی معنی یہ ہے کہ مرض وہ شے ہے جو بدن کو عارض ہو کر اسے اس اعتدال سے خارج کر دے جو بدن کے ساتھ خاص ہے اور بدن کے افعال میں خلل واقع کر دے اور مرض کا مجازی معنی یہ ہے کہ ان اعراض نفسانیہ کو مرض کہہ دیا جاتا ہے جو نفس کے کمال میں مخل ہوں جس طرح کہ جہل، برا عقیدہ، حسد، کینہ، بغض اور گناہوں کی محبت وغیرہ۔

منافقین کے مرض بڑھنے سے مراد یہ ہے کہ ان کی حکومت ان سے چھوٹ گئی اس سے ان کے دلوں کو تکلیف ہوئی تھی اور نبی کریم ﷺ کے معاملے کی پختگی اور آپ کی شان کا دن بدن بڑھنا وغیرہ انکے دلوں کو انتہائی تکلیف دیتا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اس مرض کو اس طرح بڑھایا کہ انکے دلوں پر مہر لگا دی یا ان کو تکالیف زیادہ دیں اور بار بار وحی کو نازل کرنا اور مدد در مدد کرنا یہ تمام باتیں ان کے مرض بڑھنے کی وجوہ تھیں۔

مرض سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ جب مسلمانوں کی شوکت کا منافقین نے مشاہدہ کیا تو ان کے دلوں میں بزدلی اور ڈر داخل ہو گیا اور مرض کی زیادتی سے مراد اس کو بڑھانا ہے اس سبب سے کہ دشمن کے خلاف رسول اللہ ﷺ کی مدد کو بڑھایا اور بلاد میں وسعت عطا فرمائی۔

سوال نمبر ۱۴۰: قرآن کریم میں کہیں اس بڑھنے کو قرآنی سورۃ کی طرف اور کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس فرق کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اسناد کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس فعل کا مسبب ہے اور سورۃ کی طرف اس کی اسناد اس حیثیت سے ہے کہ وہ سبب ہے اس فعل کا (جیسے فـــزادتھـــم رجسا)

سوال نمبر ۱۴۱: عذاب الیم سے کیا مراد ہے اور عذاب کو الیم کے ساتھ موصوف کیوں کیا گیا نیز یکذبون کی مختلف قراءتیں ذکر کرتے ہوئے ان کے حوالے سے یہاں پیدا ہونے والے معانی متعین کریں؟

جواب: عذاب الیم سے عذاب مؤلم (درد میں ڈالنے والا) مراد ہے اور عذاب کی الیم کے ساتھ صفت لانا مبالغہ کے طور پر ہے امام عاصم، حمزہ اور کسائی نے اسے یَکْذِبُوْنَ (مجرد سے) پڑھا اور باقیوں نے یُکَذِّبُوْنَ (باب تفعیل سے) پڑھا پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ان کے کذب کے سبب (ما مصدر یہ ہوگا) یا ان کے کذب کے بدلے ان کو جزاء دیتے ہوئے (اور ان کا کذب ان کا قول اٰمنا تھا) اور یُکَذِّبون کی قراءت کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں اپنے دلوں سے، جب وہ اپنے شیطانوں کے پاس الگ ہوتے ہیں۔ یا یکذبون کَذَّبَ جو کہ مبالغہ یا تکثیر کے لیے ہے سے ماخوذ ہے۔ یا یہ کذب الوحشی سے ماخوذ ہے یہ تب کہا جاتا ہے جب وحشی جانور کسی راستے پر چلے اور کھڑا ہوتا کہ اپنے پیچھے دیکھے۔ تو منافق بھی چونکہ متحیر و متردد ہوتا ہے اس لیے یکذبون کی اسناد منافقین کی طرف ہے۔

سوال نمبر ۱۴۲: کذب کسے کہتے ہیں، اس کا شرعی حکم کیا ہے نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ کذب ثلث کذبات آپ اس بات کو واضح کریں کہ اللہ تعالیٰ کے نبی کی طرف کذب کی نسبت کیسے صحیح ہوگی؟

جواب: خلافِ واقع خبر دینا کذب کہلاتا ہے شرعاً یہ حرام ہے۔ حدیث پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کذب کی نسبت مجازاً ہے حقیقت میں وہ کذب نہیں ہے ہاں صورت میں کذب کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اسے کذب فرمایا گیا۔ بلکہ حقیقت میں وہ تعریض ہے اور تعریض سے مراد یہ ہے کہ کلام سے ایک جانب اشارہ کیا جائے لیکن اس

سے غرض دوسری جانب کی ہو۔

سوال نمبر ۱۴۳: اِنواذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض یہاں ھم ضمیر کا مرجع کون لوگ ہیں اور حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا اس کی وضاحت کیا ہے؟

جواب: ھم ضمیر کا مرجع منافقین ہیں جو کہ مَنْ کے ضمن میں ہیں۔

حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت کے اہل ابھی تک نہیں آئے تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے اہل فقط وہی منافقین نہیں بلکہ ان کے بعد بھی ایسے لوگ آئیں گے جو ان منافقین کی حالت پر ہوں گے یعنی منافقین ختم و فنا نہیں ہوئے بلکہ ابھی آئیں گے اور یہ تاویل اس لیے کی گئی کہ اس آیت کا اتصال ماقبل کے ساتھ اس ضمیر کے ذریعے ہے جو اس میں ہے اور وہ ھم ہے۔

سوال نمبر ۱۴۴: فساد کا مفہوم کیا ہے ان لوگوں کے فساد کی کیا صورت تھی اور قیل کا قائل کون ہے؟

جواب: فساد کہتے ہیں شے کا اعتدال سے نکل جانا اس کی ضد اصلاح ہے اور فساد ہر ضرر دینے والی شے کو اور صلاح ہر نفع دینے والی شے کو شامل ہے منافقین کے فساد کی یہ صورت تھی کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر اور کفار کے ساتھ دوستی کر کے مسلمانوں کے راز کو ظاہر کر کے جنگوں اور فتنوں کو برانگیختہ کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات زمین میں فساد کو مستلزم ہے نیز ان کا فساد یہ بھی تھا کہ وہ معاصی کو ظاہر کرتے اور دین متین کی توہین کرتے تھے (کیونکہ شرائع میں خلل اندازی اور واجب سے اعراض ہرج پیدا کرتا ہے) قیل کا قائل یا تو اللہ تعالیٰ ہے یا رسول اللہ ﷺ یا بعض مومنین ہیں۔

سوال نمبر ۱۴۵: انما نحن مصلحون میں کلمۂ حصر لانے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: منافقین یہ کہتے تھے کہ لا تفسدوا سے ہمیں خطاب کرنا درست نہیں اس لیے کہ

ہمارا کام تو صرف اصلاح کرنا ہے اور ہماری حالت تو فساد کے شائبے سے بھی پاک ہے اور آیت کریمہ میں انما کلمہ حصر لا کر اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا کیونکہ انما جس پر داخل ہو تو اس کے مابعد پر محصور ہونے کا فائدہ دیتا ہے جیسے انما زید منطلق زید صرف چلنے والا ہے تو انما نے زید کو انطلاق پر محصور کر دیا۔

سوال نمبر ۱۴۶: الا انهم هم المفسدون کے بارے میں مفسر علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ یہ انکار رد ابلغ ہے اس کی وضاحت میں انہوں نے جو کچھ بیان فرمایا اسے واضح انداز میں ذکر کریں؟

جواب: اس کے رد ابلغ ہونے کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) الا انهم هم المفسدون کو بطور جملہ مستانفہ لایا گیا کیونکہ یہ جملہ حکم کو ذہن میں مضبوطی سے بٹھا دیتا ہے۔

(۲) اس جملہ مستانفہ کو کلمۂ الا سے شروع کیا گیا اور الا چونکہ ہمزۂ انکار اور حرفِ نفی سے مرکب ہے لہذا یہ اپنے مابعد کے تحقق کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ نفی کا انکار اثبات کو پکا کرتا ہے۔

جس طرح کہ أليس ذلك بقادر میں ہمزۂ انکار ليس (نفی) پر داخل ہے لہذا اس نے قدرت کی تحقیق وتقریر کا فائدہ دیا۔

اور چونکہ ألا اور اس کا مابعد تحقیق کا فائدہ دیتا ہے اس لیے اس کا مابعد عموماً جواب قسم ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۱۴۷: و اذا قيل لهم امنوا کو مفسر نے نصیحت اور ارشاد کی تکمیل قرار دیا اس کی وضاحت کیجئے؟

جواب: اس کی وضاحت یہ ہے کہ نفسِ ایمان اگرچہ تصدیق قلبی کا نام ہے لیکن ایمان کا کمال

دو امروں سے ہوتا ہے۔

(۱) مالا ینبغی (افساد) سے خالی رہنا۔

(۲) ماینبغی (لوگو (صحابہ کرام) کے ایمان جیسا ایمان لانا) سے مزین ہونا اور نصیحت ان دونوں میں سے فقط ایک کے ساتھ تمام و کامل نہیں ہوتی۔ اس لیے پہلے لا تفسدوا فرمایا گیا اب امنوا فرمایا گیا۔

سوال نمبر ۱۴۸: کما امن الناس ترکیب میں کس چیز میں ہے۔ ما کونسا ہے اور الناس پر الف لام کی کیا حیثیت ہے۔ اگر اسے اسم جنس قرار دیا جائے تو اسکا استعمال کیسے ہوگا اور عہد کا قرار دیا جائے تو کون لوگ مراد ہوں گے۔ یہ بھی بتائیں کہ اس آیت کی روشنی میں زندیق کی توبہ قبول ہونے اور اقرار باللسان کو ایمان قرار دینے کے حوالے سے کیا حکم ہوگا؟

جواب: کما امن الناس مصدریت کی بناء پر چیز نصب میں ہے اور ما مصدریہ ہے یا کافۃ عن العمل ہے جس طرح کہ ربما میں۔ اور الناس میں الف لام جنس کا ہے اور اس سے مراد انسانیت میں کامل لوگ اور عقل کے مطابق عمل کرنے والے لوگ ہیں۔

یا الناس پر لام عہد کا ہوگا اور اس سے مراد رسول اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھی ہوں گے یا ان کے ہم جنس جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی مراد ہوں گے۔

زندیق (کفر کو چھپانے والا اور اس پر اصرار کرنے والا اور ایمان کو ڈر کی وجہ سے ظاہر کرنے والا ہے) کی توبہ قبول ہوتی ہے (وجہ استدلال اس طرح ہے کہ منافقین زنادقہ میں سے ہیں اور انہیں ایمان کا حکم دیا گیا امنوا کما الایۃ تو مناسب ہے کہ ان کی توبہ قبول ہو اور ان کی توبہ قبول ہے تو زنادقہ کی توبہ بھی مقبول ہوگی)

اور اس آیت سے اس پر بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ ایسا ایمان اقرار باللسان کا

نام ہے چاہے اخلاص سے مقترن ہو یا نہ ہو۔(وجہ استدلال یہ ہے کہ امنوا کو کما امن الناس کے ساتھ مقید کیا گیا۔اور معنی یہ ہے کہ ایمان لاؤ جو اخلاص سے ملا ہوا ور نفاق سے دور ہو اب اگر فقط شہادتین کا اقرار ایمان نہ ہوتا تو مسمّی ایمان بغیر اخلاص کے حاصل نہ ہوتا اور کما امن الناس مجرد و مستدرک (یعنی جس کی ضرورت نہیں پہلے سے معلوم ہے) ہوتا کیونکہ امنوا سے جس ایمان کا حکم دیا گیا وہ تصدیق مع الاخلاص ہے لہٰذا کما امن الناس کی ضرورت نہ ہوتی)

سوال نمبر۱۴۹: قالوا أنومن الایۃ میں ہمزہ کی کیا حیثیت ہے اور السفھاء کا الف لام کونسا ہے نیز صحابہ کرام کے لیے اس لفظ کو منافقین نے کس بنیاد پر استعمال کیا ہے؟

جواب: اس میں ہمزہ انکار کے لیے ہے (یعنی ہم ایمان نہیں لائیں گے) اور السفھاء کا الف لام عہد کا ہوگا اور اس سے اشارہ الناس (جو کہ کما امن الناس میں ہے) کی طرف ہوگا۔ یا لام جنس کا ہوگا اور ان کے اعتقاد کے مطابق تمام صحابہ کرام اس میں داخل ہوں گے۔

منافقین نے اس لفظ کو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لیے اس بنیاد پر استعمال کیا کہ منافقین ان کی رائے کو فاسد سمجھتے تھے یا ان کی شان کی تحقیر کرنے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا کیونکہ اکثر مومنین فقراء تھے۔اور ان میں سے غلام بھی تھے۔اور اگر الناس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور آپ کے ہم مثل ہوں تو پھر اس لفظ کے استعمال کی وجہ ان پر سختی کرنا اور ان کی پروا نہ کرنا ہے جو ان میں سے ایمان لائے۔

سوال نمبر۱۵۰: الا انھم ھم السفھاء کو ان کی تجہیل میں مبالغہ قرار دیا گیا آپ یہ بتائیں کہ کس بنیاد پر یہ مبالغہ فی التجہیل قرار پاتا ہے؟

جواب: سوال نمبر۱۴۶ کے جواب میں الا اور ان سے مبالغہ کی وجوہ مفصل بیان کر دی گئی

ہیں وہاں ملاحظہ فرمائیں لیکن یہاں ولکن لا یعلمون بھی ہے تو اس میں مبالغۃ التجھیل اس طرح ہوگا کہ وہ جاہل جسے اپنی جہالت کا بھی علم نہ ہو تو یہ اس جاہل سے زیادہ جاہل ہے جو اپنی جہالت کا معترف ہے۔

سوال نمبر ۱۵۱: واذا لقوا الذین امنوا بظاہر تکرار معلوم ہوتا ہے کیونکہ ومن الناس من یقول امنا پہلے فرمادیا گیا کیا واقعی یہ تکرار ہے اگر نہیں تو اس کی وضاحت کریں؟

جواب: حقیقتاً اس میں تکرار نہیں ہے کیونکہ یہاں سے منافقین کا مومنین اور کفار کے ساتھ معاملہ بیان کیا جارہا ہے جب کہ ومن الناس الایۃ میں ان کے مذہب کا بیان اور ان کے نفاق کی تمہید ہے۔

سوال نمبر ۱۵۲: اس آیت کریمہ کے شانِ نزول میں امام بیضاوی رحمہ اللہ نے جو واقعہ نقل کیا ہے اسے تحریر کریں؟

جواب: ابن اُبَی اور اس کے ساتھی ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک صحابہ کرام کی ایک جماعت کا ان کے سامنے سے گزر ہوا تو ابن ابی اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ دیکھو میں ان بے وقوفوں کو تم سے کیسے پھیرتا ہوں اس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا کہ صدیق بنی تیم کے سردار شیخ الاسلام ثانی رسول اللہ ﷺ فی الغار اپنے جان ومال کو رسول اللہ ﷺ کے لیے خرچ کرنے والے کو خوش آمدید ہو۔ پھر اس نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور کہا بنی عدی کے سردار کو خوش آمدید ہو جو کہ فاروق ہیں قوی ہیں دین میں، اور اپنے مال وجان کو رسول اللہ ﷺ کے لیے خرچ کرنے والے ہیں پھر اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور کہا خوش آمدید اے رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی اور آپ کے داماد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ باقی تمام بنو ہاشم کے سردار تو اس پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

سوال نمبر ۱۵۳: واذا خلوا الی شیطینھم اس آیت کے حوالے سے بتایئے
خلوا سے متعلق مفسر نے کیا تحقیق بیان کی ہے؟
جواب: خلوا، خلوت بفلان والیہ سے ہے یہ تب کہا جاتا ہے جب تو اس کے ساتھ
اکیلا ہو یا یہ خلامنك ذم سے ہے، جس کا معنی ہے وہ مذمت تجھ سے تجاوز کر گئی اور اسی سے
قرونِ خالیہ گزری ہوئی امتیں ہیں۔ یا یہ خلوت بہ سے ہے یہ تب کہا جاتا ہے جب تو اس
کے ساتھ مسخری کرے (اور یہ الی کے ساتھ متعدی ہے انھاء کے معنی کی تضمین کے
ساتھ)

سوال: منافقین کو شیاطین کیوں کہا گیا نیز لفظِ شیطان کے مادۂ اشتقاق کے بارے میں
کیا بات فرمائی گئی۔

جواب: شیطین سے مراد وہ لوگ ہیں جو سرکشی میں شیطان کے مشابہ ہیں اور وہ کفر کو
ظاہر کرنے والے ہیں یا بڑے بڑے منافق ہیں اور ان کے لیے لفظِ شیٰطین بطور
استعارہ مصرحہ استعمال کیا گیا۔

امام سیبویہ نے شیطن کے نون کو اصلی قرار دیا اس صورت میں یہ شطن
سے ہوگا یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی دور ہو جائے تو شیطان بھی ھدایت سے دور ہوتا ہے
اور اس مذہب کی گواہی عربوں کا قول تشیطن دیتا ہے اور دوسرے مذہب کے مطابق
اس کا نون زائد ہوگا اس صورت میں شاط سے مشتق ہوگا یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی
باطل ہو جائے اور شیطان کے اسماء میں سے ایک نام باطل بھی ہے۔

سوال نمبر ۱۵۴: قالوا انا معکم میں معیت سے کیا مراد ہے نیز مومنوں کو جملۂ فعلیہ
اٰمنّا اور شیاطین کو جملہ اسمیہ انا معکم کے ساتھ خطاب کیوں کیا گیا اس امتیاز کی وجہ کیا
ہے؟

جواب: یہاں معیت سے جسمانی معیت مراد نہیں بلکہ دین اور اعتقاد میں معیت (ہمراہی) مراد ہے، منافقین نے مؤمنین سے جملہ فعلیہ اور کافرین سے جملہ اسمیہ کے ساتھ خطاب کیا اس لیے کہ مؤمنین کے ساتھ خطاب میں انہوں نے اپنے ایمان کے احداث (نیا پیدا ہونا) کا دعوی کیا اور فعل حدوث پر دلالت کرتا ہے اس لیے جملہ فعلیہ لائے اور شیاطین سے خطاب میں انہوں نے اپنی سابقہ حالت (کفر) پر ثابت قدمی کا دعوی کیا اس لیے جملہ اسمیہ استعمال کیا جو کہ ثبات پر دلالت کرتا ہے نیز جب مؤمنین سے خطاب کیا تو اس وقت عقیدہ اور صدق رغبت میں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کو تاکید لانے پر ابھارتی نیز مؤمنین سے انہیں توقع نہ تھی کہ وہ ہمارے ایمان کے کمال کا دعوی مان لیں گے بخلاف کفار کے کہ وہاں باعث بھی تھا اور توقع بھی۔

سوال نمبر ۱۵۵: انما نحن مستھزؤن کو مفسر علیہ الرحمۃ نے تاکید یا بدل قرار دیا ہے اس کی وضاحت کیجئے اور لفظ استھزاء کی لغوی تحقیق بھی پیش کریں؟

جواب: ماقبل کی تاکید تو اس لیے قرار دیا کہ ماقبل یہ تھا کہ (اے کافرو!) ہم تمہارے ساتھ ہیں اور یہاں انہوں نے کہا ہم استہزاء کرنے والے ہیں تو جو کسی سے استہزاء کرے اور اسے ہلکا سمجھتا ہو تو وہ اس کے خلاف پر مصر ہوتا ہے لہذا یہاں بھی وہ ایمان کے خلاف یعنی کفر پر مصر ہیں۔

یا یہ ماقبل سے بدل ہے کیونکہ جس نے اسلام کی تحقیر کی اس نے کفر کی تعظیم کی اور ماقبل انا معکم ہے تو انما نحن مستھزؤن اس سے بدل ہو جائے گا۔

استھزاء بمعنی مذاق کرنا اور استخفاف (حقیر سمجھنا) کو کہا جاتا ہے ھزئت و استھزأت دونوں ایک ہی معنی میں بولے جاتے ہیں اور اس کا اصل (لغت میں) خفت ہے اور یہ ھزأ سے مشتق ہے اور یہ قتل سریع کو کہا جاتا ہے جس طرح کہ ھزأ فلان کہا جاتا

ہے جب کہ کوئی اپنی جگہ مرجائے اور ناقتہ متھزأ بہ کہا جاتا ہے جب وہ اسے تیز لیکر چلے اور اسے ہلکا محسوس کرے۔

سوال نمبر ۱۵۶: جب استہزاء کا معنی مذاق کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے یہ لفظ کیوں ذکر کیا حالانکہ وہ اس سے پاک ہے صاحب کتاب نے اس سلسلے میں کیا فرمایا؟

جواب: اللّٰہ یستھزئ بھم' کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے استہزاء کا بدلہ دے گا اب استہزاء کی جزاء کو استہزاء کا نام دیا گیا۔ جس طرح کہ سیئہ کی جزاء کو سیئہ کہہ دیا جاتا ہے یا تو لفظ کے لفظ کے ساتھ مقابلے کی وجہ سے یا یہ کہ مقدار میں استہزاء اور اس کا بدلہ مساوی ہیں یا یہ کہ استہزاء کا وبال چونکہ انہی پر لوٹے گا یا لوٹتا ہے اس لیے یستھزئ فرمایا گیا۔ یا یہ کہ حقارت اور ذلت جو کہ استہزاء کو لازم ہے ان پر نازل ہوتی ہے اور استہزاء سے غرض بھی ذلیل وحقیر سمجھنا ہوتی ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ حقیقتاً استہزاء تو نہیں فرماتا لیکن مستھزئ والا معاملہ ان سے فرماتا ہے دنیا میں مسلمانوں کے احکام ان پر جاری فرما کے اور آخرت میں یہ کہ جنت کی طرف ان کے لیے ایک دروازہ کھول دے گا جب وہ اس کی طرف دوڑیں گے تو اچانک وہ دروازہ ان پر بند فرما دے گا۔

سوال نمبر ۱۵۷: اللّٰہ یستھزئ بھم کو جملہ معطوفہ کی بجائے جملہ مستانفہ لانے میں کیا حکمت ہے نیز فعل مضارع کیوں لایا گیا حالانکہ اسم فاعل کا صیغہ گذشتہ عبارت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے؟

جواب: اسے جملہ مستانفہ لانے میں یہ حکمت ہے کہ اس بات پر یہ جملہ دلالت کرے کہ اللہ تعالیٰ خود ان کو ان کے استہزاء کا بدلہ دے گا (مومنوں کو اس کی ضرورت نہیں) نیز ان کا استہزاء اس کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا جو اللہ تعالیٰ ان سے معاملہ فرمائے گا۔ اور اسم فاعل کی جگہ فعل مضارع استعمال کرنے میں یہ حکمت ہے (حالانکہ مقام

اسم فاعل کا تقاضا کرتا تھا کیونکہ منافقین نے بھی اسم فاعل کا صیغہ استعمال کیا) کہ فعل میں
تجدد اور حدوث ہوتا ہے اب استہزاء کا بدلہ بھی وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا رہے گا اور اس میں تجدد دائم
رہے گا اور اللہ تعالٰی کی سزائیں اسی طرح ہوتی ہیں۔

سوال نمبر ۱۵۸: یمدھم کی لغوی تحقیق ذکر کرنے کے بعد بتائیں کہ یہاں اس کا کون سا
معنی مراد ہے؟

جواب: یمد مد الجیش وامدہ سے ماخوذ ہے یہ تب کہا جاتا ہے جب وہ لشکر کو زیادہ
کرے اور قوت دے۔ اور اسی سے مددت السراج والارض ہے جب ان کی
اصلاح کی تیل اور سماد (گوبر) سے اور یمد مد فی العمر سے ماخوذ نہیں کیونکہ یہ
لام سے متعدی ہوتا ہے اور یہاں پہلا معنی (اضافہ وقوت) مراد ہے

سوال نمبر ۱۵۹: اس آیت کے حوالے سے معتزلہ کا نقطۂ نظر بتائیں نیز طغیان کا لغوی معنی کیا
ہے اور یہاں کیا مراد ہے؟

جواب: چونکہ معتزلہ کے نزدیک کلام کو ظاہر پر رکھنا متعذر ہو گیا تو انہوں نے کہا کہ جب اللہ
تعالٰی نے منافقین سے اپنی مہربانیاں روک لیں جو وہ مومنین کو عطا فرماتا ہے اور ان کے کفر
پر اصرار اور اپنے آپ پر توفیق کا راستہ روکنے کے سبب ان کو رسوا فرما دیا تو اس سبب سے ان
کے دلوں میں زنگ اور اندھیرا زیادہ ہو گیا اور مومنوں کے دلوں میں انشراح اور نور بڑھ گیا۔
یا یہ کہ اللہ تعالٰی نے شیطان کو ان کے اغواء (گمراہ کرنے) پر قدرت دی تو
شیطان نے ان کی سرکشی کو بڑھا دیا ہاں اس فعل کی اسناد اللہ تعالٰی کی طرف مجازاً کر دی گئی
اسناد الفعل الی المسبب کے ساتھ (فعل کی مسبب کی طرف نسبت کر دینا) اور طغیان کی ان
کی طرف نسبت کی گئی تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ اللہ تعالٰی کی طرف اسناد حقیقتاً ہے طغیان کا معنی یہ
ہے کہ سرکشی اور غلو فی الکفر میں حد سے بڑھ جانا اور اصل (لغت) میں شے کا اپنے مکان

سے تجاوز کر جانے کو کہتے ہیں اور یہاں پہلے بیان کردہ معنیٰ (کفر میں غلو کرنے اور سرکشی میں حد سے بڑھ جانا) مراد ہے۔

سوال نمبر ۱۶۰: گمراہی خریدنے سے کیا مراد ہے نیز اشتراء کا مفہوم بیان کرتے ہوئے اس مقام پر اس کے اطلاق کی وجہ لکھیں؟

جواب: گمراہی خریدنے سے مراد یہ ہے کہ منافقین نے گمراہی کو ہدایت پر اختیار کیا اور ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی۔

لغت میں اشتراء اس کو کہتے ہیں کہ ثمن کو خرچ کرنا تاکہ اعیان میں سے جو شے مطلوب ہے اسے حاصل کیا جائے۔ لیکن یہاں بطور استعارہ اس کا استعمال ہوا ہے اس چیز سے اعراض کرنے کے لیے جو اس کے قبضے میں ہو اور اس کے بدلے وہ دوسری چیز کو حاصل کرنے والا ہو چاہے وہ شے معانی میں سے ہو یا اعیان میں سے پھر لفظ اشتـــــــراء میں وسعت پیدا کی گئی لہذا یہ استعمال ہوا شے سے اعراض کرتے میں اسکے غیر میں طمع کرتے ہوئے اور یہاں معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اس ہدایت کو چھوڑ دیا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے فطرت بنایا وہ فطرت جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا۔ اس حال میں کہ وہ گمراہی کو حاصل کرنے والے تھے وہ گمراہی جس کی طرف وہ گئے یا انہوں نے گمراہی کو اختیار کیا اور ہدایت کی بجائے اسے پسند کیا۔

سوال نمبر ۱۶۱: فما ربحت تجارتهم کو استعارۂ ترشیحیہ قرار دیا اس کی وضاحت کیجیے؟

جواب: سب سے پہلے استعارہ ترشیحیہ کی وضاحت کی جاتی ہے کہ یہ وہ استعارہ ہے جس میں ایسی صنعت یا ایسی نوع کا کلام لایا جائے۔ جو مستعار منہ (معنیٰ حقیقی لفظ اشتراء کا) کے مناسب ہو۔

اب فما ربحت تجارتهم میں استعارہ ترشیحیہ اس طرح بنے گا کہ پہلے ان

لے جانا۔(استبدال الضلالة بالهدی)میں اشتراء کا استعمال کیا گیا اب یہ (فما ربحت تجارتھم) کا استعمال اور استعارہ لایا گیا جو اشتراء حقیقی کے ملائم ومناسب ہے۔

سوال نمبر۱۶۲: ربح کسے کہتے ہیں تجارت کی طرف اس کی نسبت کیسے صحیح ہوگی اور ان کے ہدایت یافتہ نہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: ربح 'رأس المال پر زیادتی کو کہتے ہیں۔

ربح کی نسبت تجارت کی طرف کی گئی (حالانکہ نفع وربح تاجروں کو ہوتا ہے) اس میں گنجائش واتساع پیدا کر کے 'اس لیے کہ تجارت صاحب تجارت سے ملی ہوتی ہے کہ تجارت فعل ہے تاجر کا اور فعل کا فاعل کے ساتھ اتصال ہوتا ہے لہذا مجازاً ربح کی نسبت تجارت کی طرف کردی گئی یا تجارت کی تاجر کے ساتھ مشابہت ہونے کی وجہ سے اس حیثیت سے کہ تجارت نفع ونقصان کا سبب ہے۔

یہاں ان کے ہدایت یافتہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تجارت کے طریقوں سے واقف نہ تھے۔ کیونکہ تجارت سے مقصود راس المال کی سلامتی اور مزید نفع ہوتا ہے جب کہ یہ لوگ دونوں کو ضائع کر بیٹھے کیونکہ ان کا راس المال فطرۃ سلیمہ اور عقل تھی جب انہوں نے ان گمراہیوں کا اعتقاد رکھا تو ان کی استعداد عقل ضائع ہوگئی لہذا ان کا راس المال باقی نہ رہا جس سے وہ کمال ومرتبہ یعنی نفع حاصل کرتے۔

سوال نمبر۱۶۳: مثلهم كمثل الذي استوقد میں منافقین کے حالات کو ضرب المثل کے ذریعے بیان کرنے کی کیا وجہ ہے اور ضرب المثل کا کونسا مقام ہوتا ہے اس سلسلے میں مفسر کی تقریر اپنے الفاظ میں بیان کریں؟

جواب: منافقین کے حالات کو ضرب المثل سے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ضرب المثل سے بات زیادہ واضح اور پختہ ہوتی ہے کیونکہ یہ دل میں زیادہ اترتی ہے اور سخت دشمن کو چپ کرا

دیتی ہے اور متخیل (خیال) کو محقق (حقیقت) اور معقول کو محسوس کر دکھاتی ہے۔

ضرب المثل وہاں ہوتی ہے جہاں غرابت (غیر مانوسیت) ہو لیکن پھر بطور استعارہ استعمال ہونے لگی ہر اس حالت، قصہ یا صفت کے لیے جس کی شان بلند ہو اور جس میں غرابت (غیر مانوسیت) ہو۔

سوال نمبر ۱۶۴: اگر نورھم میں ضمیر مجرور کا مرجع منافقین ہوں تو اسم موصول واحد مذکر کیسے صحیح ہوگا۔ نیز یہ بتایئے کہ اگر الذی کو الذین کے معنی میں لیں تو کیا القائم کو القائمین کی جگہ لا سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

جواب: یہاں اسم موصول الذی' الذین کے معنی میں ہے نیز یہ اسم تام نہیں کیونکہ اپنے صلہ سے مل کر مبتداء وغیرہ بنتا ہے۔ بلکہ اسم تام کی جز کی طرح ہے تو اس کا حق ہی یہ ہے کہ اس کی جمع نہ لائی جائے اور واحد اور جمع اس مین برابر ہوں تیسری وجہ یہ ہے کہ الذی اپنے صلہ سے مل کر طویل ہو جاتا ہے اس لیے اس میں تخفیف کی گئی اور الذی لایا گیا۔ یا اس سے مقصود (المستوقدین) کی جنس ہے یا الفوج الذی استوقد لہذا اس اعتبار سے جمع کی ضمیر اس کی طرف راجع ہو سکتی ہے۔

القائم کو القائمون کی جگہ نہیں لا سکتے اس لیے کہ الذی تو وصف سے مقصود نہیں وہ جملہ مقصود ہوتا ہے جو الذی کا صلہ ہے اس لیے الذین کی جگہ الذی لا سکتے ہیں بخلاف القائم کے کہ یہ وصف سے مقصود ہے لہذا القائمون کی جگہ القائم نہیں لا سکتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۶۵: استیقاد اور نار کے حوالے سے مصنف نے کیا وضاحت کی ہے؟

جواب: استیقاد طلب الوقود والسعی فی تحصیله (وقود ایندھن کو طلب کرنا اور اسکے حصول میں کوشش کرنا) کو کہتے ہیں وقود آگ کے بلند ہونے اور اس کے

شعلوں کے مرتفع ہونے کو کہتے ہیں اور نارٌ نــار ینور نوراً سے مشتق ہے نارا تب کہا جاتا ہے جب کوئی بھاگ جائے کیونکہ بھاگنے میں حرکت واضطراب ہوتا ہے۔ اور آگ میں بھی حرکت واضطراب ہوتا ہے۔

سوال نمبر ١٦٦: اضـاء ت کی اسناد النار کی طرف ہے یا ما کی طرف اگر ما کی طرف ہو تو مؤنث کا صیغہ کیسے درست ہوگا؟

جواب: اگر اضـاء ت کو متعدی مانا جائے تو اضـاء ت کی اسناد الـنـار کی طرف ہوگی اور اگر اسے متعدی نہ مانا جائے تو اس کی اسناد مـا کی طرف ہوگی اور اس کی تانیث اس وجہ سے ہے کہ مــا حــولـہٗ اشیاء کثیرہ اور اماکن متعددہ ہیں اور جمع کی طرف بتاویل جماعت ذواہ مؤنث کی ضمیر راجع کرنا جائز ہے۔ لہٰذا اضـاء ت کی اسناد ما کی طرف درست ہے۔

سوال نمبر ١٦٧: ذهــب الله بـنـورهـم کیا واقع ہو رہا ہے۔ مصنف کی تقریر وضاحت سے ذکر کریں اور یہ بھی بتائیں کہ ذھب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کن وجوہ سے کی گئی؟

جواب: یہ لـمـا کا جواب واقع ہو رہا ہے یا یہ جملہ تمثیل سے بدل واقع ہو رہا ہے اور هـم ضمیر کا مرجع الذی ہے اس کو معنی پر محمول کرتے ہوئے اور چونکہ اس کا معنی جمع کا ہے لہٰذا جمع کی ضمیر الذی کی طرف راجع کرنا درست ہے۔ اور چونکہ یہاں حـمـل عـلى المعنى ہے اس لیے بـنـورهـم فرمایا گیا بـنـارهـم نہیں فرمایا گیا (حالانکہ مقام یہی چاہتا تھا) اس لیے کہ نـار کے روشن کرنے سے مقصود نور (روشنی) ہی ہے۔

ذهـا ب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے کی گئی کہ ہر شے اس کے فعل سے ہے یا یہ کہ اطفاء (آگ کا بجھنا) امر خفی یا امر آسمانی سے ہوا جیسے ہوا یا بارش وغیرہ سے اس کا بجھنا پھر اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی گئی سبب کے نامعلوم ہونے کی وجہ سے یا مبالغہ کے طور پر کیونکہ کوئی جتنا زیادہ طاقتور ہوگا اس کے فعل کا اثر بھی اتنا ہی قوی ہوگا۔

سوال نمبر ۱۶۸: ظــلــمـات کو جمع لانے میں کیا حکمت ہے نیز اس آیت میں منافقین کے سلسلے میں جو مثال دی گئی اس کی توضیح مطلوب ہے یہ بھی بتائیں کہ ظلمت کو ظلمت کہنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ظــلــمـا ت کو جمع لانے میں یہ حکمت ہے کہ منافقین کی کئی ظلمتیں ہیں مثلاً کفر کی ظلمت، نفاق کی ظلمت، یوم جزاء کی ظلمت، گمراہی کی ظلمت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی ظلمت، دائمی عذاب کی ظلمت، یا ظلمتِ شدیدہ مراد ہے اور وہ اتنی شدید ہے کہ گویا کئی ظلمتیں تہ بتہ ہیں۔

آیت میں بیان کردہ مثال کی توضیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے مثال بیان فرمائی جس کو ہدایت کی ایک قسم عطا فرمائی تو اس نے اس کو ضائع کر دیا اور اس کے ذریعے دائمی نعمتوں تک نہیں پہنچا لہٰذا وہ حیران اور حسرت کرنے والا باقی رہ گیا اور پہلی آیت جس بات کو شامل ہے یہ اس کی توضیح و تقریر کرتی ہے اور اس کے عموم میں یہ منافقین بھی داخل ہوں گے کیونکہ ان کی زبانوں نے جو حق بات کہی انہوں نے کفر کو دل میں چھپا کر اسے ضائع کر دیا۔ نیز اپنے شیطانوں کے پاس جا کر کفر کو ظاہر کر کے اسے ضائع کر دیا۔ اور یہ ان حضرات کی مثال ہے جنھوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی جو کہ فطرتاً ان میں رکھی گئی تھی یا ایمان لانے کے بعد اپنے دین سے پھر گئے یا ان کے ایمان کی مثال دی اس حیثیت سے کہ وہ ایمان ان کے اموال دماء اور اولاد کی حفاظت کرتا ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ غنیمتوں اور احکام میں شریک ہیں، اس آگ کے ساتھ جو روشنی حاصل کرنے کے لیے جلائی گئی، اور اس ایمان کے اثر چلے جانے اور اس کے نور کے بجھ جانے کی مثال دی (وہ اثر جانے کا سبب ان کی ہلاکت اور ان کے راز فاش ہونا تھا) اللہ تعالیٰ کے اس نور کو بجھا دینے اور اس کو لے جانے کے ساتھ، ظلمت کو ظلمت اس لیے کہتے ہیں کہ

ظلمت اس محاورے سے ماخوذ ہے ما ظلمك ان تفعل كذا تجھے کام کرنے سے کس نے روکا چونکہ ظلمت بھی آنکھ کو مسدود اور دیکھنے سے ممنوع کر دیتی ہے اس لیے اسے ظلمت کہتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۶۹: منافقین کو بہرے گونگے اور اندھے کہا گیا اس تشبیہ کی وضاحت کریں؟

جواب: منافقین کو بہرے گونگے اور اندھے کہا گیا حالانکہ حقیقتاً وہ ایسے نہ تھے اس لیے کہ انہوں نے اپنے کانوں کو حق سننے سے روک دیا تو گویا وہ بہرے ہیں اور اپنی زبانوں سے حق جاری نہ کیا تو گویا وہ گونگے ہیں اور آیات اور معجزات کو انہوں نے نہ دیکھا تو گویا وہ اندھے ہیں۔

سوال نمبر ۱۷۰: صم، بکم، عمی کی اعرابی حالت کیا ہے نیز ان کی لغوی تحقیق کریں؟

جواب: یہ تینوں منصوب پڑھے گئے اس بناء پر کہ یہ ترکھم کے ھم مفعول سے حال واقع ہیں۔ جب کہ پہلی قراءت کے مطابق یہ مرفوع ہیں ابتداء کی بناء پر۔

صم لغت میں صلابت (سختی) کو کہتے ہیں جو اجزاء کے اجتماع کی وجہ سے پیدا ہو جائے اور بکم، خرس (گونگے پن) کو کہتے ہیں اور عمی عدم البصر عما من شانه ان يبصر (نہ دیکھنا اس شخص کا جس کی شان یہ ہے کہ وہ دیکھے) اور عدمِ بصیرت کو بھی عمی کہہ دیتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۷۱: فهم لا يرجعون میں رجوع سے کیا مراد ہے نیز فاء کس بات پر دلالت کرتی ہے؟

جواب: رجوع سے مراد یہ ہے کہ وہ اس ہدایت کی طرف نہیں لوٹیں گے جس کو انہوں نے بیچ دیا اور ضائع کر دیا یا وہ اس گمراہی سے نہیں لوٹیں گے جس کو انہوں نے خرید لیا یا یہ مطلب ہے کہ وہ متحیر ہیں ان کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں اور جہاں سے انہوں نے

ابتداء کی اس کی طرف کیسے لوٹیں گے۔

فھم پرفاء اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ منافقین کا احکام سابقہ سے متصف ہونا ان کے حیران ہونے اور رک جانے تجسس ہو جانے کا سبب ہے۔

سوال نمبر ۱۷۲: او کصیب الخ کا عطف کس پر ہے اور حرف اَوْ کی پوری تحقیق کیا ہے؟

جواب: اس کا عطف الذی استوقد پر ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی کمثل ذوی صیب۔ اَوْ اصل میں شک کے اندر تساوی کے لیے ہے لیکن پھر اس میں وسعت پیدا کر دی گئی کہ اس کا اطلاق بغیر شک کے تساوی و برابری کے لیے ہونے لگا۔ (جس طرح کہ جالس الحسن او ابن سیرین تو یہاں او تساوی بغیر شک کے لیے ہے کہ حسن بصری کی مجلس کو اختیار کر یا ابن سیریں کی)

سوال نمبر ۱۷۳: صیب کا معنی کیا ہے اور یہاں کیا مراد ہے نیز صیب کو نکرہ اور السماء کو معرفہ لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: صیب بادل اور بارش دونوں کو کہا جاتا ہے یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ صیب کو نکرہ لانے میں حکمت یہ ہے کہ اس سے بارش کی ایک قسم یعنی تیز بارش مراد ہے اور السماء کو معرفہ لانے میں حکمت یہ ہے کہ اس سے اس بات پر دلالت کرانا مقصود ہے کہ السماء کی بارش تمام زمین پر پہنچتی ہے (مطبق کا یہی معنی ہے) اور آسمان کے تمام آفاق سے اترنے والی ہے۔

سوال نمبر ۱۷۴: فیہ ظلمات ورعد الخ: ظلمات سے کیا مراد ہے اور رعد کسے کہتے ہیں نیز برق سے کیا مراد ہے؟

جواب: اگر صیب سے مراد مطر ہو تو ظلمات سے مراد قطروں کا پے در پے نازل ہونے کی وجہ سے اس کا بوجھل و کثیف ہونا ہے نیز بادلوں کا اندھیرا اور رات کا اندھیر مزید برآں۔ اور

اگر صیب سے مراد بادل ہو تو ظلمات سے مراد اس کی سیاہی اور تہہ بتہہ ہونا ہے رات کا اندھیرا بھی اس کے ساتھ ہے۔

رعد ایسی آواز کو کہتے ہیں جو بادلوں سے سنی جاتی ہے۔ اور مشہور بات یہ ہے کہ اس کا سبب بادلوں کے اجسام کا رگڑ کھانا اور مضطرب ہونا ہے جب ہوا انہیں دھکیلتی ہے اور یہ ارتعاد سے ماخوذ ہے۔

برق سے مراد وہ روشنی ہے جو بادلوں میں سے چمکتی ہے (برق الشیء سے ماخوذ ہے)

سوال نمبر ۱۷۵: یجعلون اصابعھم الخ ضمیر کا مرجع بتائیں اور کیا یہ ضمیر محذوف کی طرف لوٹ سکتی ہے اگر جواب ہاں میں ہے تو اس کی وضاحت کریں اور عربی شعر سے استشہاد پیش کریں؟

جواب: ضمیر کا مرجع اصحاب صیب ہیں یہاں ضمیر محذوف کی طرف لوٹ سکتی ہے اس لیے کہ اصحاب کا لفظ اگرچہ محذوف ہے اور صیب کے قائم مقام ہے لیکن اسکا معنی باقی ہے۔ لہذا اس کی طرف ضمیر راجع کرنا جائز ہے جس طرح کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے شعر میں راجع کی گئی۔

وہ شعر یہ ہے: یسقون من ورد البریص علیھم

بردی یصفق بالرحیق السلسل

اس شعر سے استشہاد اس طرح ہوتا ہے کہ یصفق کی ضمیر مذکر کی ہے حالانکہ اس کا مرجع بردی ہے جو کہ مونث ہے تو مذکر کی ضمیر معنی کے اعتبار سے راجع کی گئی کیونکہ بردی سے پہلے ماء مضاف مقدر ہے اور اس کا معنی باقی ہے۔ لہذا آیت میں بھی اس اعتبار سے ضمیر راجع کی گئی۔

سوال نمبر ۱۷۶: صواعق کا واحد کیا ہے نیز رعد اور صواعق میں کیا فرق ہے ایک قراءت میں صواقع ہے تو کیا یہ قلب مکانی نہیں اگر نہیں تو کیوں؟

جواب: صواعق کا واحد صاعقہ ہے۔اور رعد اس آواز کو کہا جاتا ہے جو بادلوں سے بنی جاتی ہے جب کہ صواعق، رعد کی شدید آواز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ آگ ہو جس چیز پر بھی اس کا گزر ہو اس کو ہلاک کر دے، نیز صواعق کا اطلاق کبھی مطلقاً ہولناک شی پر کر دیا جاتا ہے چاہے وہ مسموع ہو یا مشاہد۔

صواقع میں قلب مکانی نہیں ہوئی کیونکہ تصریف میں صواقع اور صواعق دونوں کی بنا الگ الگ ہے اور اگر چہ ان کے حروف آگے پیچھے ہیں لیکن معنی دونوں کا ایک ہے۔اور اگر صواقع میں قلب مکانی ہوتی تو صواعق کی گردان پر اکتفاء کیا جاتا حالانکہ دونوں کی الگ الگ گردانیں ہوتی ہیں لہذا دونوں اپنی اپنی جگہ بذاتِ خود اصل ہیں۔

سوال نمبر ۱۷۷: حذر الموت، منصوب پڑھنے کی وجہ بتائیں نیز موت کے حوالے سے مفسر کی تقریر ذکر کریں؟

جواب: حذر الموت، یجعلون کی علت (مفعول لہ) ہے جس کی وجہ سے منصوب ہے اور موت، حیات کے زوال کو کہتے ہیں اور بعض نے یہ کہا کہ موت ایسی عرض ہے جو حیوۃ کی ضد ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا خلق الموت والحیوۃ یہاں خلق بمعنی ایجاد ہے اور ایجاد عدمی شے سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ وجودی شی سے متعلق ہوتا ہے لہذا موت و حیوۃ وجودی شے اور ایک دوسرے کی ضد ہوں گے۔

اور جو موت کو زوالِ حیات (عدم حیوۃ) کہتے ہیں، ان کے نزدیک موت اور حیات میں تقابل عدم و ملکہ ہے (تقابل عدم و ملکہ سے مراد یہ ہے کہ عدمی وجودی کا محل بن

سکے) وہ اس کا رد یوں کرتے ہیں کہ خلق یہاں تقدیر کے معنی میں ہے اور ہر شے چاہے وہ وجودی ہو یا عدمی وہ ازل میں مقدر ہو چکی ہے لہذا آپ کا اس آیت سے استدلال (معدوم کے وجودی ہونے پر) درست نہیں۔

سوال نمبر ۱۷۸: یکاد البرق الخ: اس جملے کی حالت بتائیں نیز کاد افعال مقاربہ میں سے ہے اس کی نحوی وضاحت کیجئے؟

جواب: یہ دوسرا جملہ مستانفہ ہے جو کہ سوال مقدر کا جواب ہوتا ہے۔ کاد کی وضع اس بات کی خبر دینے کے لیے ہے کہ اس کی خبر کا مضمون فی الحال وقوع کے اعتبار سے قریب ہے اس کے سبب کے عارض آنے کی وجہ سے (یعنی کاد کا اسم کاد کی خبر کے ساتھ موصوف ہونے میں اس طرح قریب ہے کہ وہ فی الحال واقع ہو جائے سبب کے پائے جانے کی وجہ سے کیونکہ وجود سبب وجود مسبب کا فائدہ دیتا ہے) لیکن وہ خبر پائی نہ جائے یا تو کسی مانع کے پائے جانے کی وجہ سے یا شرط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے اور کاد کی خبر کا فعل مضارع ہونا شرط ہے (تاکہ قرب کے مقصود پر دلالت کرے) بغیر اَنْ کے (تاکہ قرب کی تاکید ہو جائے حال پر دلالت کے ساتھ جب کہ ان مستقبل کی علامت ہے)

سوال نمبر ۱۷۹: یخطف کی مختلف قراءتوں کی وضاحت کریں اور اس کا لغوی معنی بتائیں؟

جواب: یخطف کا لغوی معنی (الاخذ بسرعة) تیزی سے پکڑ لینا جس کو اُچک لینا کہا جاتا ہے اس کی مختلف قراءتیں ہیں۔

(۱) يَخْطَفُ (طاء کے کسرہ کے ساتھ ماضی میں اور مضارع میں طاء کے فتحہ کے ساتھ)

(۲) يَخَطِّفُ یہ اصل میں یختطف (باب افتعال سے) تھا پھر تاء کا فتحہ نقل کر کے خاء کو دیدیا گیا پھر تا کا طاء میں ادغام کیا تو یَخَطِّفُ ہو گیا۔

(۳) یخِطِّفُ (اصل میں یختطف تھا) پھر تاء کی حرکت کو ادغام کے لیے گرا دیا
پھر تا کا طاء میں ادغام کر دیا گیا اب خاء اور حرف مدغم (تاء) دو ساکن جمع ہو گئے
تو خاء کو کسرہ دیدیا گیا یا تو طاء کی متابعت میں یا اس لیے کہ قاعدہ یہ ہے کہ
الساکن اذا حرك حرك بالكسر (ساکن کو جب حرکت دی جائے تو
کسرہ کی حرکت دی جاتی ہے) پھر حرف مضارع کو فاء کے تابع کر کے کسرہ دے
کر یخِطِّفُ پڑھتے ہیں۔

(۴) یتخطف (باب تفعل)

سوال نمبر ۱۸۰: کلما اضاء لهم الخ یہ جملہ کس حالت میں ہے اگر جملہ مستانفہ ہے تو
اس کی وجہ کیا ہے اور اضاء لازم ہے یا متعدی تفصیل سے بیان کریں؟

جواب: یہ تیسرا جملہ مستانفہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سوال ہوا کہ وہ کیا کرتے ہیں بجلی کے
چمکنے اور اس کے مخفی ہونے کی حالت میں تو اس جملے کے ساتھ سوال کا جواب دیا گیا (کلما
الخ میں استیناف سے مقصود ذوی الصیب کے احوال کی شدت بیان کرنا اور اس میں
اندھیرے کی شدت بیان کرنا ہے)

اضاء یا تو متعدی ہے یا لازم اگر متعدی ہو تو اس کا مفعول محذوف ہو گا اور
تقدیر عبارت یہ ہو گی کہ کلما نورلهم ممشى اخذوه (ممشی محذوف ہے)
جب بھی ان کے لیے راستہ روشن کرتا ہے تو وہ اس پر چل پڑتے ہیں۔ اور اگر اضاء لازم ہو تو
اس کا معنی یہ ہو گا کہ کلما لمع لهم مشوا فى مطرح نوره (جب بھی ان کے
لیے روشنی ہوتی ہے تو وہ اس کے نور واقع ہونے کی جگہ میں چلتے ہیں)

سوال نمبر ۱۸۱: اس آیت کے ضمن میں ابو تمام کے قول سے استشہاد اور اس پر اعتراض
وجواب کی وضاحت کریں؟

جواب: ابوتمام نے کہا

هما اظلما حالی ثمة اجلیا

ظلامیهما عن وجه امرد اشیب

پہلے مفسر نے یہ فرمایا تھا کہ اظلم بھی اضاء کی طرح متعدی آتا ہے اور اس کی شہادت اظلم (فعل مجہول) کی قراءت دیتی ہے کیونکہ فعل مجہول متعدی فعل سے آتا ہے اور ابوتمام کا قول بھی اس کے متعدی ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ هما اظلما میں تثنیہ کی ضمیر کا مرجع عقل اور دھر ہے ترجمہ یہ ہے کہ عقل اور دھر نے میری دو حالتوں (اس سے مراد تعمیم ہے یعنی تمام حالتوں) کو تاریک کر دیا پھر ان حالتوں کی تاریکیوں کو دور کر دیا امرد (عمر کے اعتبار سے جوان) اور اشیب (تجربے کے اعتبار سے بوڑھے) کے چہرے سے تو استشہاد اس طرح کیا کہ اس شعر میں اظلما متعدی استعمال ہوا کیونکہ اس کا مفعول مذکور ہے۔

اس پر اعتراض ہوتا ہے جس سے پہلے ایک تمہید شعراء کے چار طبقے ہیں۔

(۱) جاھلیون: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کا زمانہ نہ پایا چہ جائے کہ وہ اسلام لاتے جیسے امرؤ القیس اور زہیر اور طرفہ وغیرہ۔

(۲) مخضرمون یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا اور وہ اسلام لے آئے جیسے حضرت حسان رضی اللہ عنہ اور لبید۔

(۳) متقدمون اہل اسلام میں سے متقدمین جیسے فرزدق، جریر وغیرہ تو ان تین قسموں کے شعراء کے کلام اور اشعار سے لغت میں استشہاد ہو سکتا ہے۔

(۴) المحدثون (من اهل الاسلام) یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے صدر اول کے بعد پروان چڑھے جس طرح ابوتمام، ابوالطیب، بحتری وغیرہ۔

تو اس تمہید کے بعد اعتراض کی تقریر یہ ہے کہ ابوتمام تو محدثین میں ہیں جن کے

کلام وشعر سے لغت میں استشہاد نہیں ہوسکتا مصنف نے کیسے استشہاد کیا تو مفسر نے اس کا جواب دیا کہ یہ اگرچہ محدثین میں سے ہیں لیکن علماء عربیہ میں سے بھی تو ہیں اور جو یہ کہتے ہیں اگر اس کو اس کے قائم مقام کر دیں جس کو وہ روایت کرتے ہیں تو اس سے استشہاد ہوسکتا ہے لہذا ان کے قول کو ان کی روایت کے قائم مقام کر کے استشہاد کرنا درست ہے۔

سوال نمبر ۱۸۲: ولو شاء اللہ میں شاء کا مفعول کیا ہے۔ اس کا حذف ہونا صحیح ہے یا نہیں اس پر دلیل دیں اور یہ بھی بتائیں کہ حرف لَوْ کیا عمل کرتا ہے اور کس مقصد کے لیے آتا ہے۔

جواب: شاء کا مفعول ان یذھب بسمعھم و ابصارھم ہے اور یہ محذوف ہے اور اس کا حذف ہونا صحیح ہے کیونکہ لو کا جواب (لذھب بسمعھم و ابصارھم) دلالت کرتا ہے (نیز شاء اور اراد میں مفعول نہیں ذکر کیا جاتا سوائے مستغرب شے کے کہ اس صورت میں مفعول ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسے لو شئت ان ابکی دما لبکیتہ تو یہاں مفعول دماء ہے جو عجیب ہے کہ آنکھ خون بہائیں یعنی روئیں اس لیے اسے ذکر کیا گیا)

لو حرف شرط ہے یہ ماضی پر داخل ہوتا ہے اور چونکہ ماضی مبنی ہوتی ہے اس لیے یہ اس میں کوئی عمل نہیں کرتا اور لو اس مقصد کے لیے آتا ہے کہ (یہ دو جملوں پر داخل ہوتا ہے اور اس بات پر دلالت کرتا ہے) کہ اول نہیں پایا جاتا دوسرے کے نہ پائے جانے کی وجہ سے یعنی انتفاء ثانی سبب ہے انتفائے اول کا (یہ مذہب علامہ ابن حاجب کا ہے اور مصنف کا بھی یہی مختار ہے ورنہ بعض نحویوں نے یہ کہا کہ لو انتفائے ثانی کے لیے آتا ہے بسبب انتفائے اول کے)

سوال نمبر ۱۸۳: مذکورہ بالا آیات کو جملہ شرطیہ لانے میں کیا حکمت ہے اور تاثیر اسباب کے حوالے سے یہ آیت کس طرح راہنمائی کرتی ہے؟

جواب: اس کے تین فائدے ہیں:

(۱) سبب مقتضی کے پائے جانے کے باوجود ان کی سماعت و بصارت نہ گئی اس لیے کہ یہاں مانع (عدمِ مشیت) موجود ہے اور سبب مقتضی سے مراد رعد اور برق ہے۔

(۲) اسباب مسببات میں اثر تب کرتے ہیں جب اللہ تعالٰی کی مشیت بھی پائی جائے۔

(۳) مسببات کا وجود اس حال میں کہ وہ اسباب عادیہ سے ملا ہوا ہو یہ اللہ تعالٰی کی قدرت سے واقع ہے۔

تاثیرِ اسباب کے حوالے سے یہ آیت اس طرح راہنمائی کرتی ہے کہ آیت میں یکاد البرق یخطف میں یخطف کی اسناد برق کی طرف کی گئی اور یہ اسناد الفعل الی المسبب ہے وہ الگ بات ہے کہ مانع کی موجودگی میں سبب تاثیر نہیں کرتا اور نہ تاثیرِ اسباب مع مشیۃ اللہ تعالٰی آیت کریمہ سے ثابت ہے۔

سوال نمبر ۱۸۴: لفظ شیء کے حوالے سے مفسر کی تقریر کا خلاصہ پیش کریں اور اس سلسلے میں معتزلہ کیا کہتے ہیں؟

جواب: شیء موجود کے ساتھ خاص ہے (صرف موجود کو شے کہا جاتا ہے) (یہ اشاعرہ کا مذہب ہے)

دلیل: ان کی دلیل یہ ہے کہ شیء اصل میں شاء کا مصدر ہے (چونکہ مصدر کبھی معنی للفاعل اور کبھی معنی للمفعول ہوتا ہے لہذا) یہ کبھی شائی کے معنی میں آتا ہے اس وقت یہ باری تعالٰی کو شامل ہوگا جیسے قل ای شیء اکبر شھادۃ قل اللّٰہ شھید (یہاں شے کا اطلاق باری تعالٰی پر کیا گیا کہ کیا کوئی شے شہادت کے اعتبار سے سب سے بڑی ہے؟ آپ فرمادیں اللہ شہید (گواہ) ہے۔

اور کبھی شئی ء مشئی ء کے معنی میں آتا ہے یعنی جس کا وجود چاہا گیا ہے اور جس کے وجود کو اللہ تعالیٰ چاہے وہ بھی فی الجملہ موجود ہوتا ہے جس طرح ان اللہ علی کل شیء قدیر' اللہ خالق کل شیء ان دونوں آیتوں میں شیء بمعنی مشئی ء ہے (چونکہ جب شئی ء بمعنی شائی ہوتو پھر باری تعالیٰ پر اطلاق ہوتا ہے لیکن جب بمعنی مشی ء ہوتو پھر اطلاق نہیں ہوتا اس لیے ان دونوں آیتوں میں استثناء کی ضرورت نہیں جو قادر علی نفسہ کے لازم آنے کی وجہ سے کیا جائے)

معتزلہ: معتزلہ کا موقف یہ ہے کہ جس چیز کا موجود ہونا صحیح ہے وہ شے ہے اور یہ واجب وممکن دونوں کو شامل ہے یا ہروہ جس کا جاننا یا جس کے بارے میں خبر دینا صحیح ہو وہ شی ہے اس صورت میں یہ شئی ء ممتنع کو بھی شامل ہوگی۔ (معتزلہ کے مذہب کے مطابق ان کو اس آیت میں دلالت عقلی کی وجہ سے ممکن کے ساتھ تخصیص لازم ہوگی کیونکہ محال و ممتنع تحت القدرت نہیں)

سوال نمبر ۱۸۵: مثلھم اور او کصیب ان دونوں آیات کی تمثیلات مرکبہ اور تمثیلات مفردہ کے حوالے سے وضاحت کریں؟

جواب: (تمثیل مرکب تو یہ ہوتی کہ ایسا مجموعہ جس کے اجزاء آپس میں ملے ہوئے ہیں اسطرح کہ وہ شے واحد ہو جائے اس مجموعہ سے جو کیفیت حاصل ہو رہی ہو اس کو اس کی مثل کیفیت سے تشبیہ دینا) ان آیات میں تمثیل مرکب اس طرح ہوگی کہ منافقین کی حیرت وشدت والی حالت کو اس حالت کے ساتھ تشبیہ دینا جسے وہ شخص برداشت کرتا ہے جس کی آگ بجھ گئی ہو یا اس آدمی کی حالت کے ساتھ تشبیہ دینا جس کو اندھیری رات میں بارش نے کڑک سمیت اور اچکنے والی بجلی سمیت آلیا۔ نیز اسے صواعق کا خوف ہو (صواعق کی تشریح ہو چکی)

تمثیل مفرد یہ ہوتی کہ مفرد اشیاء کو لے کر ان کی امثال کے ساتھ ان کو تشبیہ دینا۔
اب پہلی آیت میں تمثیل مفرد اس طرح ہوگی کہ منافقین کی ذوات کو آگ جلانے والوں کے ساتھ تشبیہ دینا اور ان کے ایمان کے ظاہر کرنے کو آگ روشن ہونے کے ساتھ تشبیہ دینا اور ایمان سے جو انہوں نے نفع اٹھایا (اپنے خون محفوظ کر کے اور مال واولاد سلامت رکھ کر وغیرہ) اس کو ماحول المستوقدین (آگ جلانے والوں کے ارد گرد) آگ جلانے کے ساتھ تشبیہ دینا۔ اور جلد ہی اسے زائل ہو جانے کو (ان کے اہلاک کے ذریعہ اور ان کی حالت کو ظاہر کر کے اور دائمی عذاب ودائمی نار میں باقی رکھنے کے ذریعے) تشبیہ دینا ان کی آگ کو بجھا دینے اور ان کے نور کو لے جانے کے ساتھ۔
اور دوسری آیت میں تمثیل مفرد اس طرح ہوگی کہ منافقین کے نفسوں کو اصحاب صیب کے ساتھ تشبیہ دینا اور ان کے اس ایمان کو جو کفر سے ملا ہوا ہے اور ان کے دھوکے کو اس بارش کے ساتھ تشبیہ دینا جس میں اندھیرے کڑک اور بجلی ہے اس حیثیت سے کہ بارش اگرچہ فی نفسہ نافع ہے لیکن جب اس مذکورہ صورت میں ہو تو اس کا نفع نقصان میں بدل جاتا ہے۔ اور منافقین کا نفاق جو مومنوں کی سزاؤں سے بچنے کے لیے اور اس چیز سے بچنے کے لیے تھا جو مومن ان کے سوا کافروں کو پہنچاتے تھے کو تشبیہ دینا انگلیوں کو کانوں میں صواعق کی وجہ سے ڈالنے کے ساتھ۔

سوال نمبر ۱۸۶: یا ایھا الناس اعبدوا الخ میں غائب کے صیغے سے حاضر کی طرف التفات کی کیا وجہ ہے یا ایھا کے حوالے سے مفسر علیہ الرحمۃ کی تقریر کا خلاصہ بیان کریں اور قرآن پاک میں عام طور پر یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟
جواب: یہاں التفات کی وجہ سامع کو متحرک کرنا اور اس کو نشاط دینا ہے نیز عبادت کے امر کی اہمیت بیان کرنا اس کی عظمت شان بتانا اور عبادت کی تکلیف کو خطاب کی لذت کے ساتھ

دور کرنا ہے یـــا ایسا حرف ہے جو بعید کو ندا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے اور کبھی اس سے قریب کو بھی نداء کی جاتی ہے اس کو بمنزلہ بعید قرار دیتے ہوئے اس کی عظمت کے پیش نظر جیسے دعا کرنے والے کا یا اللہ یا رب کہنا حالانکہ وہ اس کی شاہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے یا قریب کی غفلت اور سوء فہم کی وجہ سے اسے حرف یــــا سے ندا کی جاتی ہے یا مدعولہ کی اہمیت کے پیش نظر اور اس پر زیادہ ابھارنے کی وجہ سے نیز یا حرف ندا منادیٰ کے ساتھ جملہ مفیدہ ہوتا ہے اس لیے کہ یا فعل کے قائم مقام ہے اور ای معرف باللام اور یاء کے درمیان وسیلہ وذریعہ ہے اس لیے یا بھی حرف تعریف ہے اور الف لام بھی اور اب تعریف کے دو حرفوں کا جمع ہونا متعذر ہے اس لیے درمیان میں ای لے آتے ہیں اور ای اگرچہ حقیقت میں معرف باللام تک یا کے پہنچانے کا ذریعہ ہے اور مقصود بالنداء معرف باللام ہی ہوتا ہے لیکن جب ای کے ساتھ حرف نداء ملا تو اس کو منادیٰ کا حکم دے دیا گیا اس لیے کہ یہ بھی مبنی بر ضم ہے اب نداء سے جو مقصود ہو اس پر رفع لازم ہے یہ بتانے کے لیے کہ یہی مقصود ہے۔ ای اور مقصود بالنداء کے درمیان تاکید کے لیے اور ای جس مضاف الیہ کا مستحق ہوتا ہے اس کے عوض کے لیے ھائے تنبیہ لے آتے ہیں۔

اور قرآن کریم میں اس طریقے پر کثیر نداء وارد ہوئی اس لیے کہ یہ تاکید کی چند وجوہ کے مستقل ہے۔

سوال نمبر ۱۸۷: الناس کا مدلول کون ہے نیز یا ایھا الناس اور یا یھا الذین امنوا ان دو قسم کے خطابات میں کیا فرق ہے اور اگر الناس میں کافر بھی شامل ہیں تو ان کو عبادت کا حکم دینا کیسے صحیح ہوگا؟

جواب: (چونکہ الــنــاس جمع ہے اور جمع کا اسم جس پر الف لام داخل ہو وہ عموم کا فائدہ دیتا ہے) تو الناس لفظ کے اعتبار سے ان تمام لوگوں کو شامل ہوگا جو نزول وحی کے وقت موجود

تھے اور بعد میں آنے والے لوگوں کو اس وجہ سے شامل ہوگا کہ یہ بات متواتر ہے نبی کریم ﷺ کے دین سے کہ آپ کے خطاب کا مقتضی دونوں گروہوں (موجود اور آنے والوں) کو شامل ہے تو یہ خطاب قیام ساعت تک برقرار رہے گا سوائے ان لوگوں کے جن کو دلیل مستثنیٰ کردے (جس طرح بچے، مجنون مغمی علیہ وغیرہ)

جس سورت میں یا ایہا الناس ہو وہ مکی ہوتی ہے اور جس میں یایھا الذین امنوا ہو وہ مدنی ہوتی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ " یا ایھاالناس "جس سورۃ میں ہو وہ مکی ہوتی ہے تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ خطاب کافروں کو بھی شامل ہو کیونکہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ یہ عموم کا فائدہ دیتا ہے تو پھر ان کو عبارت کا حکم دینا کیسے درست ہوگا تو پہلا جواب یہ ہے کہ حضرت علقمہ و حضرت اسود رضی اللہ عنہما سے جو یہ قول مرفوعا مروی ہے اولاً ہم اس کے مرفوع حدیث ہونے کو نہیں مانتے کہ ممکن ہے کہ یہ قول ان دونوں بزرگوں کا ہو اور اگر اسے مرفوع تسلیم کر بھی لیں تو پھر بھی یاایھا الناس کی تخصیص کفار سے لازم نہیں آتی کیونکہ مکہ مکرمہ میں مومن بھی تھے نیز کفار کو عبادت کا حکم بھی نہیں کہ وہ مامور بہ مشترک ہے عبادت کی ابتداء کرنے اس میں اضافہ کرنے اور اس پر دوام اختیار کرنے میں لہذا کفار سے مطلوب عبادت میں شروع ہونا تو ہوگا لیکن اس چیز کو پہلے لاکر جس کی تقدیم ضروری ہے یعنی ایمان لانا۔

سوال نمبر ۱۸۹: والذین من قبلکم کی اعرابی حالت بتائیں نیز اس سے کون لوگ مراد ہیں اور والجملہ اخرجت مخرج المقدر عندھم کی وضاحت کریں لفظ مِنْ کی بجائے مَنْ موصولہ کی قراءت کیا مفہوم واضح کرتی ہے؟

جواب: والذین من قبلکم منصوب ہے محلا کیونکہ اس کا عطف خلقکم کی ضمیر پر ہے جو کہ محلا منصوب ہے لہذا معطوف بھی محلا منصوب ہوگا۔

یہ ہراسکو شامل ہے جو انسان سے مقدم ہو یا تو بالذات یا بالزمان (تقدم ذاتی تو یہ ہوتا کہ مؤخر مقدم کا محتاج ہو اور مقدم مؤخر کے لیے علت تامہ ہو۔ اور تقدم بالزمان میں مقدم کا زمانہ مؤخر کے زمانہ سے پہلے ہوتا ہے)

والجملہ اخرجت الخ مفسر نے پہلے تو یہ بتایا کہ الذی خلقکم یہ ماقبل کی صفت ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ وہ حکم جس کو صفت متضمن ہو وہ مخاطب کو پہلے سے معلوم ہونی چاہیے کہ موصوف کے لیے یہ حاصل ہے اور اس کے (مخاطب کے) نزدیک یہ بات مقرر ہونی چاہیے اب مخاطبین میں تو مشرک بھی شامل ہے اب ان کے نزدیک اس بات مقرر ہونا کہ انکا اور ان سے پہلے لوگوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے یہ غیر ظاہر ہے تو مصنف نے فرمایا اگرچہ یہ ان کے نزدیک ثابت شدہ بات نہیں لیکن یہ ثابت شدہ بات کے قائم مقام ہے اس لیے کہ وہ یا تو اس کا اعتراف کرتے تھے کہ جب ان سے پوچھا جاتا تمہیں کس نے پیدا کیا تو وہ کہتے اللہ نے یا یہ کہ وہ ادنی غور وفکر سے اس کا علم حاصل کر سکتے تھے۔

اگر مِن کے بجائے مَن موصولہ کی قراءت ہو تو اب اشکال ہوگا کہ ایک صلہ کے دو موصول (الذین مَن) کا اجتماع لازم آتا ہے اور یہ ناجائز ہے کیونکہ یہ صلہ اگر دوسرے موصول کا ہو تو یہ پہلے کا صلہ نہیں بنے گا اور اگر پہلے کا ہو تو دوسرے کا صلہ کہاں گیا۔ تو مصنف نے جواب دیا کہ یہ صلہ موصول اول کا ہے اور دوسرے موصول کا صلہ نہیں اس لیے کہ دوسرا موصول پہلے موصول کی تاکید ہے۔

سوال نمبر۱۹۰: لعلکم تتقون نحوی ترکیب میں کیا واقع ہوتا ہے اس میں کس بات پر تنبیہ ہے اور من مفعول خلقکم کا کیا مطلب ہے؟

جواب: لعلکم تتقون یہ اعبدوا کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ تقوی سالکین کے درجات کی انتہاء ہے (تقوی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شی

سے رخ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا) نیز یہ کہ عابد کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی عبادت پر مغرور ہو اور اسے خوف وامید رکھنی چاہیے۔

من مفعول خلقکم کا یہ مطلب ہے کہ پہلے یہ بتایا گیا کہ لعلکم تتقون اعبدوا کی ضمیر سے حال ہے اب یہ بتارہے ہیں کہ یا یہ خلقکم کے مفعول (کم) سے حال واقع ہورہا ہے۔

سوال نمبر ۱۹۱: الذی جعل لکم الارض فراشا الخ کا محل کیا ہے اور جعل کس کس معنی میں آتا ہے تفصیل مطلوب ہے؟

جواب: یا تو یہ ربکم کی صفت ثانیہ ہے (اس صورت میں یہ منصوب ہوگا) یا یہ مدح منصوب ہوگی اعنی فعل کے مقدر ہونے کے ساتھ یا یہ مدح ہوگی اور مرفوع ہوگی مبتدائے محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر ای ھو الذی الخ یا یہ خود مبتدا ہے اور اس کی خبر فلا تجعلوا ہوگی۔

جعل افعال عامہ (ہر فعل میں اس کا معنی پایا جاتا ہے) میں سے ہے یہ تین صورتوں میں آتا ہے۔

(۱) صار اور طفق کے معنی میں اس صورت میں یہ متعدی نہیں ہوتا جیسے فقد جعلت قلوص بنی سھیل مین جعلت صارت کے معنی میں ہے اور یہ متعدی نہیں۔

(۲) یہ اوجد کے معنی میں آتا ہے اس صورت میں یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جس طرح وجعل الظلمات والنور یہ معطوف علیہ اور معطوف مل کر ایک مفعول بنتے ہیں جعل کے جو اوجد کے معنی میں ہے۔

(۳) یہ صیر کے معنی میں ہوتا ہے اس صورت میں یہ (جعل) بمعنی صیر ہے اور

الارض اور فراشا اس کے دو مفعول ہیں (تصییر کبھی بالفعل ہوتی ہے اور کبھی بالقول اور بالعقد ہوتی ہے)

سوال نمبر ۱۹۲: زمین کو بچھونا بنانے کے حوالے سے بیضاوی کی تقریر ذکر کریں اور بناء سے کیا مراد ہے۔ آسمان سے پانی کا نزول اور زمین سے پھلوں کا نکلنا کس عقیدے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور انسانی تخلیق کے ساتھ اس کی مشابہت کی کیفیت کیا ہے؟

جواب: زمین کو بچھونا بنانے کے حوالے سے علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ زمین کے بعض حصوں کو پانی سے خالی رکھا حالانکہ پانی کی طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ زمین کو گھیر لے نیز اللہ تعالیٰ نے زمین کو سختی اور نرمی کے درمیان رکھا کہ اب اس پر بیٹھا اور سویا جا سکتا ہے جس طرح کہ بچھائے ہوئے بستر ہوں۔

بناء سے مراد تنا ہوا گنبد ہے اور بناء مصدر ہے اب مبنی کو بناء کہہ دیتے ہیں چاہے وہ گھر ہو یا قبہ یا خیمہ۔

آسمان سے پانی کا نزول اور زمین سے پھلوں کا نکلنا اس عقیدے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اسکی مشیت سے ہے لیکن پانی جو مٹی سے ملا ہوا ہو یہ پھلوں کے اخراج کا سبب اور اس کا مادہ ہے۔

انسانی تخلیق کے ساتھ اسکی مشابہت کی کیفیت یہ ہے کہ پانی میں اللہ تعالیٰ نے قوت فاعلہ رکھی اور زمین میں قوت قابلہ اب ان دونوں قوتوں کے اجتماع سے مختلف قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں اسی طرح مرد میں اللہ تعالیٰ نے قوت فاعلہ ودیعت رکھی اور رحم مادر میں قوت قابلہ ان دونوں کے اجتماع سے انسان تخلیق کے مراحل طے کرتا ہے۔

سوال نمبر ۱۹۳: سماء سے کیا مراد ہے اور من اول وثانی کی حالت کیا ہے من تبعیض کے لیے ہو تو کیا اعتراض ہوتا ہے اور اس کا جواب کیا ہے؟

جواب: سماء اسم جنس ہے اس سے بادل یا فلک مراد ہے من اول ابتداء کے لیے ہے اور من ثانیہ تبعیض کے لیے ہے یا تبیین کے لیے۔

- من تبعیضیہ ہونے کی صورت میں اعتراض ہوتا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ثمرات پانی کے ذریعے نکالے اور بعض بغیر پانی کے حالانکہ اس طرح نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بارش سے تمام کے تمام پھل نہیں نکالے گئے بلکہ بعض پھل بارش سے نکالے گئے ہیں۔

سوال نمبر ۱۹۴: ثمرات جمع قلت ہے حالانکہ یہاں جمع کثرت ہونی چاہیے تو آپ اس کا کیا جواب دیتے ہیں نیز لفظ رزق کس معنی میں ہے؟

جواب: یہاں ثمرات سے جماعة الثمرة مراد ہے یا یہ جمع قلت، جمع کثرت کی جگہ پر واقع ہے یعنی معنا یہ جمع کثرت ہے تیسرا جواب یہ ہے کہ جمع قلت و کثرت میں فرق تب ہوتا ہے جب دونوں نکرہ ہوں اور جب یہ معرف باللام ہوں تو اس صورت میں مطلقاً استغراق کے لیے آتے ہیں رزق مصدر ہے مرزوق کے معنی میں ہے۔

سوال نمبر ۱۹۵: فلا تجعلوا نہی ہے یا نفی، اگر نہی ہے تو اس کا تعلق کس سے ہے اگر نفی ہے تو منصوب ہونے کی وجہ کیا ہے نیز اس پر فاء کیوں داخل ہوئی ہے؟

جواب: یہ نہی اور نفی دونوں ہو سکتا ہے اگر نہی ہو تو اس کا تعلق اعبدوا سے ہوگا کہ اس کا اس پر عطف ہوگا اگر نفی ہو تو ان کے پوشیدہ ہونے کے ساتھ منصوب ہوگا یہ امر کا جواب ہوگا یا فلا تجعلوا کا تعلق لعل سے ہوگا اس صورت میں فلا تجعلوا کا نصب لعلی ابلغ الاسباب اسباب السموات فاطلع میں فاطلع کے نصب کی طرح ہوگا۔ یعنی فاطلع سے پہلے اَنْ پوشیدہ ہے حالانکہ یہ لعل کے بعد واقع ہوا اور لعل ان چھ اشیاء میں سے نہیں جواپنے مابعد فعل مضارع کو نصب دیتے ہیں اب لعل کو اشیاء ستہ کے ساتھ ملحق

کر دیتے ہیں کیونکہ غیر موجب ہونے میں دونوں شریک ہیں۔

فلا تجعلوا پر فاء سببیہ ہے چونکہ مبتدا شرط کے معنی کو متضمن ہے اس لیے اس کی خبر کو جزا کے قائم مقام کر کے فاء لائی گئی (یہ اس صورت میں ہے جب فلا تجعلوا کا تعلق الذی جعل لکم کے ساتھ ہو اور یہ نہی ہو اور مقول فیہ لا تجعلوا کی تاویل میں ہو تو یہ یعنی فلا تجعلوا خبر واقع ہو گی)

سوال نمبر ۱۹۶: نِدّ کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق ذکر کریں۔ ند اور مساوی میں کیا فرق ہے۔ نیز مشرکین کے معبودانِ باطلہ کو نِدّ کہنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ند' ند' ندودا سے مشتق ہے یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی بھاگ جائے اور نادّدت الرجل بمعنی خالفت الرجل آتا ہے۔

اور ند' المثل المناهی (وہ مثل جو مخالف و معادی ہو) کو کہا جاتا ہے (اور لغت میں ند' مثل کو کہا جاتا ہے یعنی جو اوصاف میں شریک ہو مخالفت کا تصور نہیں کیا جاتا) ند اس مخالف کے ساتھ خاص ہے جو ذات میں مماثل ہو اور مساوی اس کے ساتھ خاص ہے جو قدر میں مماثل ہو۔

مشرکین کے معبودانِ باطلہ کو ند کہنے کی وجہ (حالانکہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات صفات میں مساوی نہیں اعتقاد رکھتے تھے اور نہ ہی افعال میں اس کے مخالف جانتے تھے) یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت چھوڑ کر ان باطل معبودوں کی عبادت شروع کر رکھی تھی اور وہ ان کو آلھہ کہتے تھے اب ان کی حالت اس آدمی کی حالت کے مشابہ ہو گئی جو ان کو ذوات واجبہ بالذات سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ وہ اس سے اللہ تعالیٰ کی سزا دور کر سکتے ہیں اور جو بھلائی اللہ تعالیٰ انہیں عطا نہیں فرمانا چاہتا ہے وہ اسے دے سکتے ہیں تو بطور تہکم اور انکی مذمت کرتے ہوئے انداد فرمایا گیا کہ انہوں نے ایسی ذات کے لیے انداد بنائے جس

کی ند و مثل ممتنع ہے۔

سوال نمبر۱۹۷: وانتم تعلمون کی ترکیبی کیفیت اور اس کے مفعول کے حوالے سے تفسیر بیضاوی کی تقریر بیان کریں اور بتائیں کہ وانتم تعلمون کی وجہ سے فلا تجعلوا اللہ اندادا یہ علم سے مقید نہیں ہو گیا؟

جواب: وانتم تعلمون فلا تجعلوا کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے اور تعلمون کا مفعول کلیۃ متروک ہے کہ نہ وہ مقدر ہے اور نہ ہی منوی (اب یہ بات وانتم کو حال بنانے کی صورت میں یہ اشکال ہے کہ اس کا معنی یہ ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کے لیے شریک نہ بناؤ اس حال میں کہ تم جانتے ہو تو اگر کوئی نہیں جانتا جاہل ہے تو کیا وہ شریک بنا سکتا ہے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ علم کی قید سے مقصود توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) ہے اس کو حکم علم پر بند کرنا اور اس سے مقید کرنا نہیں کیونکہ عالم اور وہ جاہل جو علم حاصل کرنے پر قادر ہیں وہ مکلف ہونے میں برابر ہیں۔

سوال نمبر۱۹۸: ان دو آیتوں (یاایھا الناس اعبدوا سے وانتم تعلمون تک) کے مضمون کا خلاصہ وضاحت کے ساتھ ذکر کریں اور بتائیں کہ انسانی بدن کے ساتھ تمثیل کی کیا صورت ہے؟

جواب: ان دونوں آیتوں کا مضمون اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی نہی اور علت و مقتضی کی طرف اشارہ ہے جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عبادت کے حکم کو صفت ربوبیت پر مرتب فرمایا اس بات کی خبر دیتے ہوئے کہ رب ہونا علت ہے عبادت کی پھر اپنی ربوبیت کو بیان فرمایا کہ وہ ان کا اور ان کے آباؤ اجداد کا خالق ہے نیز وہ اپنے معاش میں زمین آسمان طعام اور لباس کے محتاج ہیں اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا بھی خالق ہے۔ اب چونکہ ان چیزوں پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قادر نہیں اس لیے پھر اس نے

اپنے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کی نہی کو مرتب فرمایا۔

انسانی بدن کے ساتھ تمثیل کی صورت یہ ہے کہ انسانی بدن کی مثال زمین کے ساتھ، نفس کی مثال آسمان کے ساتھ، عقل کی پانی کے ساتھ اور انسان کو جو فضائل عملیہ ونظریہ عطا فرمائے جو کہ عقل کو حواس کے استعمال کرنے اور قویٰ نفسانیہ کے ملاپ کے واسطے سے اسے حاصل ہوئے اس کی مثال اُن پھلوں کے ساتھ دی جو فاعل مختار کی قدرت سے آسمانی قوت فاعلہ اور زمینی قوت منفعلہ کے ملنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۹۹: وان کنتم فی ریب الخ کا پچھلی آیت سے ربط کیا ہے اور نزلنا (باب تفعیل) لانے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: پہلے اللہ عزوجل نے اپنی وحدانیت کو مقرر و ثابت فرمایا اور وہ راستہ بیان فرمایا جو اس وحدانیت کے علم تک پہنچانے والا ہے اب وہ چیز بیان فرمائی جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت پر حجت و دلیل ہے اور وہ قرآن ہے جو عاجز کر دینے والا ہے یعنی ایسی فصاحت سے جو ہر منطیق (نطق کرنے والا مبالغہ سے) کی فصاحت پر غالب آ گئی اور جن سے اس کے معارضہ کا مطالبہ کیا گیا بڑے بڑے عرب کے فصحاء میں سے ہیں تو وہ عاجز آ گئے حالانکہ وہ کثیر تھے اور انہیں شدید بغض و عناد بھی تھا۔

باب تفعیل کا صیغہ لانے میں حکمت یہ ہے کہ اس کا ایک خاصہ تدریج ہے اور چونکہ قرآن کریم بھی تدریجاً تھوڑا تھوڑا کر کے موقع محل کے مطابق نازل ہوا اس لیے باب تفعیل کا صیغہ استعمال فرمایا گیا۔

سوال نمبر ۲۰۰: لفظ سورۃ کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق ذکر کریں اور بتائیں کہ سُوَر قرآنی کو سُوَر کہنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: سورۃ کی واؤ یا تو اصلی ہوگی یا نہیں اگر اصلی ہو تو سورۃ سُوَر المدینہ سے

منقول ہوگی اور سـور المدینہ ان دیواروں کو کہتے ہیں جو شہر کے اردگرد کھڑی کی گئی ہوں یا یہ اس سورۃ سے منقول ہوگی جس کا معنی رتبہ مرتبہ ہے۔ اور اگر سورۃ کی واؤ اصلی نہ ہو بلکہ ہمزہ سے بدلی ہو تو یہ اس سورۃ سے منقول ہوگی جو کسی شے کے ٹکڑے اور قطعے کو کہتے ہیں۔

سُور قرآنی کو سورۃ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ سور المدینہ سے منقول ہے جو اُن دیواروں کو کہتے ہیں جو شہر کی حفاظت کے لیے اس کے اردا گرد بنائی گئی ہوں اور چونکہ قرآن کریم کی سورتیں بھی قرآن کریم کے ایک حصے کا احاطہ کیئے ہوئے اور انکو محفوظ کیے ہوئے ہیں یا علم کی انواع پر مشتمل ہیں اس لیے انہیں سُوَر سورۃ کہا جاتا ہے۔

سوال نمبر ۲۰۱: مِنْ مِثْلِـه میں لفظ مِـنْ اور ضمیر مجرور کے حوالے سے وضاحت کریں اور بتائیں کہ ضمیر مجرور کا مرجع کیا ہے اور اس سلسلے میں اولیٰ کیا ہے؟

جواب: اس میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے یا تبیین کے لیے اور امام اخفش کے نزدیک زائد ہے اور ضمیر مجرور مما نزلنا میں ما کی طرف راجع ہے۔ اور یہ مل کر سورۃ کی صفت ہے۔ یا ضمیر کا مرجع عبدنا ہے۔ اور اس صورت میں مِن ابتداء کے لیے ہوگا یعنی ایسی سورت لاؤ جس کی ابتداء اس شخص سے ہو جو نبی کریم ﷺ کی حالت پر ہو کہ وہ بشر بھی ہو اور امی بھی اور اس نے نہ کتابیں پڑھی ہوں اور نہ علوم سیکھے ہوں۔ یا مـن مثـلـه فأتوا کا صلہ ہے اور ضمیر عبد (ﷺ) کی طرف راجع ہے۔

اولیٰ یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع مُـنَـزِّلْ ہو کیونکہ یہ اس آیت اور تمام آیات تحدی کے موافق ہے۔

سوال نمبر ۲۰۲: شـهـيـد کے مختلف معانی بیان کرنے کے بعد واضح کریں کہ یہاں شھداء سے کیا مراد ہے نیز رسول اللہ ﷺ کی صفت شـهـيـد سے کونسا عقیدہ ثابت ہوتا ہے؟

جواب: شہید کے چند معانی ہیں۔

(۱) حاضر (۲) قائم بالشہادۃ

(۳) ناظر (۴) امام (۵) مقتول فی سبیل اللہ

یہاں شہداء سے ناصر و معین مراد ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کی صفت شہید لانے میں حاضر و ناظر ہونے کے عقیدہ پر دلالت پائی جاتی ہے کیونکہ شہید حاضر کے معنی میں بھی آتا ہے۔

سوال نمبر ۲۰۳: لفظ دون کا اصلی حقیقی معنی بیان کرنے کے بعد بتائیں کہ یہاں کونسا معنی مراد ہے اور اصل معنی کے ساتھ اس کی کیا مطابقت ہے؟

جواب: اس کا حقیقی معنی تو ادنی مکان من الشیء (کسی شی کا ادنی مکان و جگہ ہے) پھر اسے رتبوں کے لیے مستعار لیا گیا پھر اس میں وسعت پیدا کر کے اس کا استعمال کیا جانے لگا ایک حد سے دوسرے حد کی طرف تجاوز کرنے میں۔

یہاں پر تجاوز والا معنی مراد ہے چونکہ اصل میں ایک حد سے دوسری حد کی طرف تجاوز کرنے کو دون کہتے ہیں تو یہاں بھی یہ معنی ہوگا کہ انکو بلاؤ اس حال میں کہ تم تجاوز کرنے والے ہو اللہ تعالیٰ کو بلانے سے اپنے شہداء کی طرف تو اصل معنی کے ساتھ مطابقت واضح ہوگئی۔

سوال نمبر ۲۰۴: لفظ من کا متعلق کیا ہے اور دعوتِ شہداء کے حوالے سے مفسر علیہ الرحمہ کی تقریر کا خلاصہ کیا ہے؟

جواب: من کا متعلق ادعو ہے اور دعوتِ شہداء کے حوالے سے مفسر علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ تم معارضہ کی طرف بلالاؤ ان کو جو تمہارے پاس حاضر ہیں یا جن کی تمہیں امید ہے اپنے انسانوں، جنوں اور آلہہ میں سے سوائے اللہ تعالیٰ کے کیونکہ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی لانے پر قادر نہیں۔ یا یہ معنی ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا گواہوں کو بلالاؤ جو تمہارے لیے

اس بات کی گواہی دیں کہ جو کچھ تم لائے ہو وہ اس مُـنَـزَّل کی مثل ہے اور اللہ تعالیٰ کی گواہی پیش نہ کرو کیونکہ یہ تو عاجز مبہوت کی عادت ہوتی ہے کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہ رہے تو کہہ دیتا ہے کہ اللہ گواہ ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی گواہی کے بارے میں ہمیں کیا علم کہ وہ کس کے حق میں ہے۔ یا یہ معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان اولیاء وآلہہ کو بلاؤ جن کے بارے میں تمہارا یہ گمان ہے کہ وہ قیامت کے دن تمہارے حق میں گواہی دیں گے۔

سوال نمبر ۲۰۵: صـــادقین میں صداقت سے کیا مراد ہے اور ان کنتم صـــادقین کا جواب کیا ہے؟

جواب: صادقین میں صداقت سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کا کلام بشر ہونا اگر واقع کے مطابق ہے تو اس کا جواب محذوف ہے جس پر ماقبل (فـاتـوا بسـورۃ الخ) دلالت کرتا ہے اور جواب یہ ہے کہ فافعلوا ذلك ای فأتوا بمثله کہ پس تم اس کی مثل لے آؤ۔

سوال نمبر ۲۰۶: صدق کی تعریف میں اختلاف نقل کریں اور دونوں طرف کی دلیل واضح کریں؟

جواب: جمہور علماء کے نزدیک الاخبار المطابق للواقع (واقع کے مطابق خبر دینے) کو صدق کہتے ہیں۔

اور نظام معتزلی کے نزدیک صدق کہتے ہیں کہ واقع کے مطابق خبر دینا اور اس کے ساتھ ساتھ مخبر کا یہ اعتقاد بھی ہو کہ یہ خبر ایسے ہی ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ منافقین حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر کہتے تھے نشهد انك لرسول الله ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قول میں جھٹلا دیا کیونکہ ان کا یہ اعتقاد نہ تھا۔

جمہور کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا کہ ان کی تکذیب ان کے قول نشهـد

میں کی گئی ہے نہ کہ انك لرسول اللہ میں۔ کیونکہ شہادت اس کی ہوتی ہے جسے انسان دل سے تسلیم کرے اب ان کے دل میں یہ نہ تھا اور نہ وہ اس میں خلوص والے تھے۔

سوال نمبر ۲۰۷: فان لم تفعلوا کو نتیجہ قرار دیا اس کی وضاحت کیجئے اور بتائیں کہ "اتیان" کی بجائے لفظ فعل کیوں لایا گیا؟

جواب: پہلے بیان فرمایا منافقین وغیرھم کے لیے جس سے وہ رسول اللہ ﷺ کے معاملہ کو اور جو آپ لائے اس کو پہچان لیں نیز ان کے لیے حق کو باطل سے الگ کر کے اب اس نتیجہ کو مرتب فرمایا کہ جب تم نے کوشش کی قرآن کریم کے معارضہ میں اور تم سب اس کی مثل یا اس کے قریب لانے سے عاجز آ گئے تو ظاہر ہو گیا کہ قرآن کریم معجز ہے اور اسکی تصدیق ضروری ہے تو تم ایمان لے آؤ اور اس عذاب سے ڈرو جو تکذیب کرنے والوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اتیان کی بجائے فعل کو لایا گیا کیونکہ فعل اتیان اور اس کے غیر کو بھی شامل ہے اور اس میں اختصار بھی ہے۔

سوال نمبر ۲۰۸: یہاں اذا کا مقام تھا لیکن حرف اِن شرطیہ لایا گیا کیوں؟

جواب: یہ بطور تحکم ہے یا ان کے ساتھ خطاب ان کے گمان کے مطابق کیا گیا کیونکہ غور وفکر سے پہلے ان کے لیے عاجز ہونا ثابت نہ تھا اس لیے وہ اس میں شک کرتے تھے ورنہ یہاں مقام اذا کا تھا جو یقین کے لیے ہے نہ کہ اِن کا جو کہ شک کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان کے عاجز آنے میں شک نہ تھا۔

سوال نمبر ۲۰۹: فان لم تفعلوا میں دو حرف جزم یعنی ان اور لم لائے گئے کس کے عمل کو ترجیح ہے اور کیوں؟ نیز حرف لن کے بارے میں مفسر نے کیا تقریر کیا ہے اور حرف مقتضب کسے کہتے ہیں؟

جواب: لم کے عمل کو ترجیح ہے اس لیے کہ اس کا عمل واجب ہے اور یہ فعل مضارع کے ساتھ

خاص ہے اپنے معمول کے ساتھ ملا ہوتا ہے بخلاف ان کے کہ وہ کبھی ماضی پر داخل ہوتا ہے اور لفظاً عمل نہیں کر سکتا' حرف لن نفی مستقبل میں لا کی طرح ہے لیکن لــن زیادہ بلیغ ہے اور یہ امام سیبویہ کے نزدیک اور امام خلیل کی ایک روایت کے مطابق حرف مقتضب ہے۔

مقتضب سے مراد مرتجل ہے جو کہ غیر منقول ہوتا ہے دوسرے لفظ سے امام خلیل کی ایک روایت کے مطابق یہ اصل میں لا ان تھا ہمزہ کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا اب الف اور نون دو ساکن جمع ہو گئے الف کو گرا دیا تو لــن ہو گیا جبکہ امام فراء کے نزدیک یہ اصل میں لا تھا الف کو نون سے بدلا تو لن ہو گیا۔

سوال نمبر ۲۱۰: لفظِ وقود پر مفسر علیہ الرحمہ کی بحث نقل کریں؟

جواب: وقود (واو کے فتح کے ساتھ) اور وقود (واو کے ضمہ کے ساتھ) جس سے آگ روشن کی جاتی ہے اور مراد اس سے ایندھن ہے۔ اور وقــود (واو کے ضمہ کے ساتھ) مصدر ہے اور مصدر کبھی فتح کے ساتھ بھی آ جاتا ہے جس طرح کہ امام سیبویہ نے فرمایا کہ ہم نے ایک شخص کو یہ کہتے سنا وقدت النار وقود ا عاليا۔ تو اس میں وَقود بالفتح مصدر ہے اور اسم ضمہ کے ساتھ آتا ہے۔ یا یہ اسم وقــود اصل میں مصدر ہی ہے پھر اسے اس چیز کا اسم بنا دیا گیا جسے جلایا جاتا ہے مجازاً استـعمال المصدر بمعنى المفعول کے قبیلے سے جس طرح فخر افتخار کے معنی میں اور زیــن تـزیین کے معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ اور ایک قرأت میں واؤ کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد اسم ہی ہے اور اگر مصدر مراد ہو تو مضاف محذوف ہوگا وقــودها احتراق الناس ان کا جلانا لوگوں کا جلانا ہے۔

سوال نمبر ۲۱۱: الـحـجـارة حجر کی جمع کیسے بنی نیز پتھروں سے کونسے پتھر مراد ہیں اور پتھروں کو ایندھن بنانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: یہ جمع غیر قیاسی قلیل الاستعمال ہے جس طرح جمل کی جمع جمالہ آتی ہے ان پتھروں سے مراد بت ہیں جن کو مشرکین خود تراشتے تھے۔

جب مشرکین نے اپنے آپ کو دنیا میں بتوں سے ملائے رکھا ان کی عبادت کی اور انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کی تو اب وقودھا الناس والحجارۃ میں ان کو مشرکین کے ساتھ ملا دیا گیا یعنی ان کو عذاب دیا جائے گا اسی سے جو ان کے جرم کا منشا ہے جس طرح کہ کافر سونے چاندی سے عذاب دیے جائیں گے یا چونکہ وہ ان سے شفاعت کی امید رکھتے تھے تو اسکی نقیض ان کو دکھانے کے لیے اور ان کی حسرت زیادہ کرنے کے لیے بت آگ میں جلائے جائیں گے۔

سوال نمبر۲۱۲: اگر گندھک کے پتھر مراد لیے جائیں تو کیا خرابی لازم آتی ہے نیز النار کو معرفہ لانے کی کیا وجہ ہے اور اس پر الف لام کونسا ہے؟

جواب: پہلی خرابی تو یہ لازم آتی ہے کہ تخصیص بغیر دلیل کے ہے اور دوسری خرابی یہ لازم آتی ہے کہ اس سے ابطال مقصود لازم آتا ہے کیونکہ غرض تو آگ کی ہولناکی اور عذاب کی شدت بیان کرنا ہے کہ وہ آگ اتنی شدید ہے کہ اس سے پتھر بھی جل جائیں گے (لکڑی کی طرح) جب کہ دوسری عام آگ سے پتھر نہیں جلتے اور گندھک تو ہر قسم کی آگ سے جل جاتی ہے۔

چونکہ یہ آیت مدنی ہے اور اس سے پہلے مکہ مکرمہ میں سورۃ تحریم میں نارا وقودھا الناس والحجارۃ نازل ہوئی (اس میں نار نکرہ ہے) تو کفار نے آگ کو اس کی صفت کے ساتھ پہچان لیا تو اب مدینہ منورہ میں اس آیت میں پھر اسی نار کا ذکر ہوا اور اسے معرفہ لایا گیا کیونکہ اس کا معہود موجود ہے اور اس پر الف لام عہد کا ہے جس سے اشارہ مذکورہ نار کی طرف ہے۔

سوال نمبر۲۱۳: اعدت للکافرین میں اعدت کوکون کونسی صورتوں میں پڑھا گیا ہے اور ہر صورت میں لغوی مطابقت کیا ہے نیز اس کی نحوی ترکیبی کیفیت کیا ہے؟

جواب: اعدت کو اعتدت (باب افعال) عتاد سے پڑھا گیا ہے اور یہ عدت کے معنی میں ہے۔ تو اس کا لغوی معنی گننا وشمار کرنا ہے اور چونکہ جو شے گن لی جاتی ہے وہ تیار ہو جاتی ہے اور آگ بھی ان کے تیار کر دی گئی ہے اور یہی مناسبت ہے لغوی معنی کے ساتھ اور جب اعتدت قراءت ہو تو پھر بھی یہی مناسبت ومطابقت ہے کیونکہ اعتدت عتاد سے ہے جو عدت کے معنی میں ہے۔

یہ جملہ مستأنفہ ہے یا قد کے پوشیدہ ہونے کے ساتھ النار سے حال واقع ہوگا۔ لیکن اس کو وقودھا کی ضمیر مجرور سے حال بنانا درست نہیں اگرچہ وقود کو مصدر بنایا جائے۔ کیونکہ اس صورت میں ذوالحال اور حال کے درمیان خبر (الناس وما عطف علیہ) کا فصل لازم آتا ہے اور مصدر اور اس کے معمول کے درمیان کلام اجنبی آجائے تو مصدر ضعیف العمل ہونے کی وجہ سے عمل نہیں کرتا۔

سوال نمبر۲۱۴: وان کنتم فی ریب الآیۃ اور فان لم تفعلوا دونوں آیتوں میں نبوت پر دلیل ہے اس کی وضاحت کیجئے؟

جواب: ان دونوں آیتوں میں نبوت پر دلیل چند وجوہ سے بنتی ہے۔

(۱) ان دونوں آیتوں میں کفار کو چیلنج کیا گیا نیز اس کے معارضہ پر انہیں ابھارا گیا اور ساتھ ساتھ ان کو زجر وتوبیخ بھی کی گئی کہ چھوٹی سی سورت بھی نہ لا سکے اس کے ساتھ ان پر سخت وعید معلق کی۔ اب کفار کثیر التعداد بھی تھے فصاحت میں مشہور ومعروف بھی اور ضد بازی میں انتہاء کو پہنچے ہوئے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے چیلنج قبول نہیں کیا اور جلاء وطنی کی طرف مجبور ہو گئے جس سے

معلوم ہو گیا کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں اور جس پر نازل ہوا وہ بھی سچا نبی ہے۔ (ﷺ)

(۲) ان دونوں آیتوں میں غیب کی خبر ہے کہ وہ ان جیسی کوئی چھوٹی سی سورت بھی نہیں لا سکتے لیکن اس کے باوجود وہ اس کے معارض نہیں ہوئے اگر ہوئے ہوتے تو یہ بات مشہور ہو چکی ہوتی کیونکہ اس میں طعن و تشنیع کرنے والے ماننے والوں سے زیادہ ہیں۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ یہ کلام اللہ ہے جس پر نازل ہوا وہ نبی برحق ہے۔

(۳) اگر نبی کریم ﷺ کو امر قرآن یا امکان معارضہ میں شک ہوتا یعنی اگر آپ نبوت کے دعویٰ میں سچے نہ ہوتے تو کفار کو اس مبالغے کے ساتھ چیلنج نہ کرتے اس خوف سے کہ آپ کی دلیل کہیں باطل نہ ہو جائے لیکن جب آپ نے اس مبالغے سے زوردار چیلنج فرمایا تو معلوم ہو گیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔ (ﷺ)

سوال نمبر ۲۱۵: وبشر الذین آمنوا کا پہلے جملے پر عطف کس قسم کا عطف ہے اگر محض فعل کا عطف ہوتا تو کیا خرابی لازم آتی اور اس خوشخبری کو لانے میں اللہ تعالیٰ کی کس عادت کریمہ کی طرف اشارہ ہے؟

جواب: یہ قصہ کا عطف قصہ پر ہے۔ یعنی متعدد جملوں کا عطف جو ایک غرض کے لیے لائے گئے ہوں ایسے جملوں پر جو ایک ہی غرض کے لیے لائے گئے ہوں۔

اور اگر محض فعل (بشر) کا عطف ہوتا تو معطوف علیہ بھی اس کے مشاکل (امر، نہی) ہوتا حالانکہ ایسا نہیں۔ یا بشر کا عطف فاتقوا پر ہوگا اب یہ اعتراض ہوگا کہ فاتقوا تو جزائے شرط ہے جب کہ وبشر جزا نہیں تو عطف کیسے درست ہو گیا تو مفسر نے جواب دیا کہ چیلنج کے بعد کفار وہ چیز نہ لا سکے جس سے وہ معارضہ کرتے تو قرآن کریم کا اعجاز ظاہر

ہوئیں تو جو اس کا منکر ہوگا وہ مستوجب عقاب ہے اور جو اس پر ایمان لائے گا وہ مستحق ثواب ہے۔ اور یہ بات تقاضا کرتی ہے کہ ان کو خوف دلایا جائے اور ان کو بشارت دی جائے تو اس کا فاتقوا کے ساتھ معنوی ربط ہو گیا جو جواز عطف کے لیے کافی ہے ان خوشخبری لانے سے اللہ تعالیٰ کی اس عادت کریمہ کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ترغیب کو ترہیب کے ساتھ لاتا ہے مخاطب کو نشاط دینے کے لیے تا کہ وہ نجات دینے والی شے کو اختیار کرے اور مہلک سے پرہیز کرے۔

سوال نمبر ۲۱۶: بشارت اور خبر میں فرق واضح کریں اور بتائیں کہ وعید میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو خود خطاب فرمایا اور بشارت نبی کریم ﷺ یا علماء مبلغین کے ذمہ لگائی۔ فرق کی وجہ کیا ہے؟

جواب: بشارت اس خبر کو کہتے ہیں جو سرور کا باعث ہو۔ جبکہ خبر میں یہ ضروری نہیں اور فقہاء کرام نے فرمایا کہ بشارت پہلی خبر کو کہتے ہیں یہاں تک کہ اگر کسی نے کہا جو مجھے میرے بیٹے کے آنے کی بشارت دے تو وہ آزاد ہے اب اگر ان تمام نے اس کو الگ الگ خبر دی تو پہلا شخص آزاد ہوگا کیونکہ بشارت پہلی خبر کو کہتے ہیں اور اگر بشارت کی جگہ اس نے خبر کا لفظ استعمال کیا تو مذکورہ صورت میں تمام غلام آزاد ہو جائیں گے۔

بشارت نبی کریم ﷺ یا علمائے مبلغین کے ذمہ سونپی گئی اس میں یہ حکمت ہے کہ ان کی شان کی عظمت بتائی جارہی ہے اب ان کے ساتھ معاملہ ان کے اضداد و مخالفین کے معاملہ کے اسلوب سے مختلف بیان فرمایا گیا نیز اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہی لوگ اس بات کے حقدار ہیں کہ ان کا غیر ان کو بشارت دے۔ اور مبارک باد دے اس کی جو ان کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

سوال نمبر ۲۱۷: صالحات کے حوالے سے امام بیضاوی نے کیا فرمایا نیز عمل کا ایمان پر

عطف کس بات کی طرف اشارہ ہے؟

جواب: صالحات ' صالحۃ کی جمع ہے اور یہ ان صفات میں سے ہے جن پر اسمیئت غالب آ گئی اب یہ اسماء کے قائم مقام استعمال ہوتی ہیں۔ جس طرح حسنۃ کہ اس میں اسمیت غالب ہو گئی اور یہ بغیر موصوف کے استعمال ہوتا ہے۔ اور صالحات ان اعمال کو کہتے ہیں جن کو شریعت نے جائز قرار دیا ہو نیز اس کی تحسین بھی فرمائی ہو اور صالحات کی تانیث خصلۃ یا خلۃ کی تاویل پر ہے اور اس میں لام جنس کا ہے عمل کے ایمان پر عطف سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس بشارت کے استحقاق کا سبب دونوں (ایمان و عمل صالح) کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ ایمان (تحقیق و تصدیق) بنیاد اور عمل صالح عمارت ہے اور عمارت کے بغیر بنیاد اور بنیاد کے بغیر عمارت کا کوئی فائدہ نہیں۔ نیز اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال مسمّی ایمان سے خارج ہیں کیونکہ یہ اگر اس میں داخل ہوں تو عطف الشیء علی نفسہ لازم آتا ہے جو کہ باطل ہے اسی طرح شے کا عطف اس پر جس میں وہ شے داخل ہے باطل ہے۔

سوال نمبر ۲۱۸: ایمان اور عمل کا الگ الگ ذکر ایک عقیدہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کی وضاحت کیجئے؟

جواب: اسکا جواب سوال نمبر ۲۱۲ میں مفصل بیان ہو چکا ہے (یعنی ایمان فقط تصدیق کا نام ہے عمل اس میں داخل نہیں)

سوال نمبر ۲۱۹: جنت کی اصل کیا ہے جنت کو جنت کہنے اور جمع لانے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: جنۃ (مرۃ ایک دفعہ چھپنا) جَنٌّ سے ماخوذ ہے جو کہ جَنَّۃٌ کا مصدر ہے یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی چھپ جائے۔ اب سایہ دار درخت کو جنۃ کہتے ہیں کیونکہ اس کی شاخیں ملی ہوئی ہوتی ہیں گویا کہ وہ اپنے ماتحت کو چھپا دیتا ہے پھر باغ کو جنت کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں گھنے سایہ دار درخت ہوتے ہیں اور دار الثواب کو جنت کہا جاتا ہے کہ اس میں کئی باغات

ہیں اور بعض نے جنت کی وجہ تسمیہ یہ بتائی کہ دنیا میں انسانوں کیلئے یہ چھپی ہوئی ہے (یعنی جنت کی نعمتیں)

اس کو جمع لانے میں حکمت یہ ہے کہ جنتیں سات ہیں۔

(۱) جنت الفردوس (۲) جنت عدن (۳) جنت نعیم

(۴) دار الخلد (۵) جنت الماوی (٦) دار السلام

(۷) عِلِّیُّوْنَ

سوال نمبر ۲۲۰: لھم جنات میں لام سے کس بات کی طرف اور کیسے اشارہ کیا گیا ہے وضاحت کیجئے؟

جواب: لھم میں لام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مؤمن ان باغات کے مستحق ہیں ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے جس پر اس بشارت کا ترتب ہے اور قاعدہ ہے کہ کسی وصف پر حکم کا ترتب اس بات کی خبر دیتا ہے کہ یہ وصف اس حکم کی علت ہے۔ لہذا ایمان اور عمل صالح یہ علت ہوں گے جنات کے استحقاق کی۔ لیکن وہ لذاتہ اس کے مستحق نہیں کیونکہ اس سے پہلے جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی ہیں وہ لذاتہ تو ان نعمتوں کے مستحق نہیں ہو سکتے چہ جائے کہ وہ مستقبل میں ان پر جزاء و ثواب کے مستحق ہوں۔ بلکہ شارع کی عطا اور اس کے وعدہ کریمہ کا مقتضیٰ ہے۔ اور یہ شارع کا وعدہ بھی مطلق نہیں کہ ایمان لے آئے تو مستحق ہو گئے بلکہ ایمان لا کر اس پر دوام اختیار کرنا اسی طرح اعمال صالحہ پر ہمیشگی اختیار کرنا بھی از بس ضروری ہے۔

سوال نمبر ۲۲۱: درختوں کے نیچے سے نہروں کے جاری ہونا کا کیا مطلب ہے نیز جریان پانی کا ہوتا ہے نہروں کا نہیں اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں نیز نہر کو نہر کہنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: جس طرح کہ نہروں کے کنارے پر درخت اُگے ہوتے ہیں اور ان کے نیچے پانی

جاری ہوتا ہے اسی طرح جنت میں درختوں کے نیچے سے نہروں کے جاری ہونے کا مطلب ہے۔(واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

نہروں کے جاری ہونے سے مراد پانی کا جاری ہونا ہے رہی یہ بات کہ نہروں کی طرف جریان کی کیوں نسبت کی گئی تو اس کے چند جوابات ہیں۔

(۱) الانهار سے پہلے میاہ مضاف محذوف ہے جس کا معنی یہ ہوگا کہ درختوں کے نیچے نہروں کے پانی جاری ہیں۔

(۲) یہاں الانہار مجاز ہے(مجاز لغوی) کیونکہ نہر مجری ماء (پانی کے جاری ہونے کی جگہ) کے لیے وضع کیا گیا ہے لیکن یہاں اس میں استعمال ہوا جو اس مجری میں جاری ہوتا ہے یعنی محل بول کر حال مراد ہے اور یہ مجاز مرسل ہے۔

(۳) یہاں مراد خود مجاری ہیں اور ان کی طرف جریان کی نسبت مجازا کی گئی۔

نہر کو نہر اس لیے کہتے ہیں کہ ن ھ ر سے جو کلمہ مرکب ہو اس میں وسعت کا معنی پایا جاتا ہے چونکہ نہر بھی وسیع مجریٰ ہوتی ہے اس لیے اسے نہر کہا جاتا ہے۔

سوال نمبر۲۲۲: کلما رزقوا الخ کی نحوی حالت کیا ہے اس کی وضاحت کریں کلما رزقا اور لفظ من اُولیٰ اور ثانیہ کے بارے میں بھی ذکر کریں کہ کیا واقع ہو رہے ہیں؟

جواب: یہ جنت کی دوسری صفت ہے (پہلی تجری الخ تھی) یا یہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے پہلی صورت میں منصوب اور دوسری صورت میں مرفوع محلا ہوگی اور اس کا مبتدائے محذوف ھی ہوگا جب کہ ضمیر جنت کی طرف راجع مانی جائے یا مبتدائے محذوف ھم ہوگا جب کہ ضمیر الذین امنوا کی طرف راجع مانی جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو اس صورت میں یہ سوال مقدر (کہ یہ جنات کے پھل دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہیں یا نہیں) کا جواب ہوگا اور جملہ مستانفہ کا محل

اعراب بالکل نہیں ہوتا لہذا اس صورت میں اس کا محل اعراب اصلا نہیں ہوگا۔

کلما ظرفیت کی بنا پر منصوب (محلا) ہے اور رزقا مفعول بہ ہے۔ اور پہلا اور دوسرا من ابتداء کے لیے ہے جو کہ حال کی جگہ واقع ہوا ہے۔

سوال نمبر۲۲۳: پہلا اور دوسرا من حال کی جگہ واقع ہو رہا ہے اس کی توضیح کیجئے اور ذوالحال کے بارے میں بھی بتائیں؟

جواب: پہلا من جو منها میں ہے اور دوسرا من جو کہ من ثمرة میں ہے یہ دونوں حال کی جگہ واقع ہو رہے ہیں یعنی اپنے متعلق کے اعتبار سے' کیونکہ حرف جر بنفسہ حال واقع نہیں ہوتا تو اس کا متعلق مبتدأ یا ابتدا نکالیں گے اور وہ حال کی جگہ واقع ہوگا۔ اب پہلے حال کا ذوالحال رزقا جو کہ مرزوقا کے معنی میں ہے ہوگا اور دوسرے حال کا ذوالحال وہ ضمیر ہوگی جو رزقا کی طرف راجع ہے اور حال ادنی (متبدأ من الاولی) میں پوشیدہ ہے اور اسے حال متداخلہ کہتے ہیں۔

سوال نمبر۲۲۴: وهذا اشارة الی نوع مارزقوا ۔ میں کس شبہ کا اور کیسے ازالہ کیا جا رہا ہے؟

جواب: شبہ یہ پیدا ہوتا تھا کہ آیت کریمہ میں ھذا اسم اشارہ ہے جو کہ محسوس مبصر کے لیے وضع کیا گیا ہے چاہے قریب ہو یا بعید اب جنتیوں کو اس سے پہلے جو پھل دیے گئے (چاہے من قبل سے دنیا میں دیے گئے پھل مراد ہوں یا جنت میں) وہ تو معدوم اور فنا ہو گئے (کیونکہ ان کو کھا لیا گیا) تو اب یہ کہنا کس طرح درست ہوگا کہ یہ محسوس اور موجود پھل ہے جو اس سے پہلے معدوم ہو گیا۔ تو مفسر نے سوال میں دی گئی عبارت سے اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا کہ جنت میں جو پھل ان کو دیا گیا یہ اشارہ بعینہ اس کی طرف نہیں بلکہ یہ اس نوع کے پھل کی طرف ہے جس طرح کہ جاری نہر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ پانی ختم نہیں

ہوگا۔ تو اب اس سے عین مشاہد مراد نہیں بلکہ پانی کی معلوم نوع مراد ہے جو جاری ہے اور پے در پے آ رہی ہے اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اشارہ بعینہ ان پھلوں کی طرف ہے تو پھر آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ یہ اس کی مثل ہے اور چونکہ دونوں (دنیا و آخرت) کے پھلوں میں کمال درجے کی مشابہت ہے اس لیے جنت کے پھل کی ذات کو بطور تشبیہ دنیا کے پھل کی ذات بنا دیا گیا جس طرح کہ کہتا ابو یوسف ابو حنیفہ (رحمہما اللہ) ابو یوسف ابو حنیفہ ہیں تو یہ ان میں کمال مشابہت کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ لہذا پہلے جواب کی صورت میں ازالہ شبہ اس طرح ہوگا کہ ان پھلوں کو محسوس مبصر کے قائم مقام کرتے ہوئے ھذا کے ساتھ اشارہ کیا گیا اور دوسرے جواب کی روشنی میں شبہ کا ازالہ اس طرح ہوگا کہ اشارہ تو جنت کے پھلوں کی طرف ہے لیکن اس پر یہ حکم لگا دیا گیا کہ یہ وہی ہے جو اس سے قبل فنا ہو چکا۔

سوال نمبر ۲۲۵: مـن قبـل سے کیا مراد ہے دنیا میں یا جنت میں دونوں صورتوں کی وضاحت مطلوب ہے نیز پھلوں میں مشابہت کا کیا مطلب ہے؟

جواب: مــن قبــل سے یا تو دنیا میں پھل مراد ہیں اب جنت کے پھل دنیا کے پھل کی جنس سے بنائے گئے تاکہ پہلی مرتبہ اسے دیکھتے ہی نفس اس کی طرف مائل ہو جائے کیونکہ طبیعتیں مالوف کی طرف مائل اور غیر مالوف سے متنفر ہوتی ہیں۔ یا مــن قبــل سے جنت میں (اس سے پہلے دیئے گئے) پھل مراد ہیں اب اس کی مشابہت کا مطلب یہ ہوگا کہ جنت کا کھانا دنیا کے کھانے کے صورت میں مشابہ ہے جس طرح کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنتوں میں کسی کو بڑا پیالہ دیا جائے گا تو وہ اس میں سے کھائے گا پھر اسے دوسرا دیا جائے گا وہ کہے گا ھــذا الــذی رزقــنا من قبل (کیونکہ وہ اسے پہلے کی مثل دیکھے گا) تو فرشتہ کہے گا کھا' رنگ ایک ہی ہے اور ذائقہ مختلف ہے۔

سوال نمبر ۲۲۶: ھذا الذی رزقنا سے جو بات ثابت ہوتی ہے واتوا به متشابھا میں

بھی اسی بات کو بیان کیا گیا اس کے باوجود اسے لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: یہ جملہ ماقبل کو پختہ کرتا ہے کیونکہ ماقبل سے یہ سمجھا گیا کہ دنیا اور جنت کے پھل باہم مشابہ ہیں۔

سوال نمبر ۲۲۷: واتوا بہ میں ضمیر مجرور کا مرجع کیا ہے دلائل کے ساتھ حرین تحریر سپرد قلم کریں؟

جواب: یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ پیچھے دو امروں کا ذکر ہے یعنی دنیا و آخرت کا پھل تو ضمیر مفرد کی کیوں راجع کی گئی تو مفسر نے اس کا جواب دیا کہ جب من قبل سے مراد دنیا میں دیے گئے پھل ہوں تو بہ کی ضمیر اس رزق کی طرف راجع ہوگی جو انہیں دنیا و آخرت میں دیے گئے یعنی جنس مرزوق کی طرف راجع ہوگی لہذا جنس کی طرف ضمیر مفرد راجع کرنا درست ہے۔ اور ما رزقوا کی طرف راجع ہونے پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ھذا الذی رزقنا من قبل دلالت کرتا ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بھما ہے اب یہ مقام تو افرادِ ضمیر کا تقاضا کرتا تھا کیونکہ پہلے غنیا او فقیرا میں ایک مراد ہے (جیسا کہ تردید کا قاعدہ ہے) لیکن اس کی طرف تثنیہ کی ضمیر راجع کی گئی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے نہ کہ لفظ کا یعنی غنی اور فقیر کی جنس کا اعتبار کیا گیا اسی طرح آیت کریمہ اتوبہ میں جنس مرزوق کا اعتبار کرتے ہوئے ضمیر کو مفرد لایا گیا۔ اور اگر من قبل سے قبلیت فی الجنۃ مراد ہو تو اس صورت میں ضمیر کا مرجع رزق ہوگا۔

سوال نمبر ۲۲۸: فان قیل التشابہ ھو التماثل فی الصفۃ الخ کے ضمن میں سوال اور جواب کی توضیح و تشریح تحریر کیجئے؟

جواب: آیۂ مبارکہ میں دنیا و آخرت کے پھلوں کو متشابہ قرار دیا گیا اس پر سوال ہوا کہ تشابہ کہتے ہیں دو چیزوں کا صفت میں ایک دوسرے کی مثل ہونا تو دنیا اور آخرت کے ثمرات میں

تماثل فی الصفت نہیں جس طرح کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جنت میں دنیا کے کھانے نہیں ہیں صرف ان کے نام ہیں۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ دنیا اور آخرت کے پھلوں میں اگر چہ مقدار اور ذائقے میں تماثل حاصل نہیں لیکن صورت میں تو تماثل حاصل ہے اور اتنی بات تشابہ کے اطلاق کے لیے کافی ہے۔

سوال نمبر ۲۲۹: عورتوں کی جنت میں طہارت سے کیا مراد ہے نیز مطھرۃ کی مختلف لغات مع دلائل نقل کریں؟

جواب: عورتوں کی پاکی سے مراد ان چیزوں سے پاک ہونا ہے جن کو حساً گندگی سمجھا جاتا ہے جیسے حیض یا طبعاً گندگی سمجھا جاتا ہے جیسے میل کچیل، بری طبیعت بدخلقی وغیرہ۔

مطھرہ کی مختلف قراءتیں ہیں

(۱) مطھرات (۲) مطھرہ (باب تفعیل سے)

جس طرح کہا جاتا ہے النساء فعلت ' وفعلن وھن فاعلة وفاعلات وفواعل یعنی النساء کی صفت مفرد و جمع دونوں طرح آتی ہے اور یہ دونوں (مطھرات ومطھرۃ) لغات فصیحہ ہیں۔

اور شاعر کا قول

واذا العذاری تقنعت واستعجلت نصب القدر فملت

میں تقنعت استعجلت اور فملت واحد مونث کے صیغے ہیں جن کا مرجع العذاری ہے جو کہ جمع ہے تو معلوم ہوا کہ مطھرہ ومطھرات دونوں فصیح لغتیں ہیں۔

(جمع کی ضمیر راجع کی گئی یا جمع کی صفت لائی گئی لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے اور مفرد صفت لائی گئی جماعۃ کی تاویل میں)

(۴) ایک قراءت میں مُطَّهَرَةٌ پڑھا گیا جو کہ متطهرة کے معنی میں ہے (یعنی مُتَطهرة کی تاء کو طاء کر کے طاء میں ادغام کر دیا گیا مطهرة ہو گیا)

سوال نمبر ۲۳۰: جنت میں کھانے اور نکاح کی ضرورت نہیں پھر وہاں رزق اور بیویاں کیوں ہوں گی؟

جواب: جنت کے کھانے اور نکاح اور تمام احوالِ دنیا کے کھانے، نکاح وغیرہ کی فقط بعض صفات میں شریک ہیں (کما قال سید البشر ﷺ لاعين رأت ولا اذن سمعت الحديث) اب ان کو دنیا کے کھانوں وغیرہ کا نام دے دیا گیا بطور استعارہ اور تمثیل ورنہ آخرت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں کی تمام حقیقت میں شریک نہیں کہ اس سے وہ چیز لازم آئے جو دنیا کے نکاح و کھانے سے سے لازم آتی ہے۔ اور یہ بعینہ دنیا کی نعمتوں کا فائدہ دے۔

سوال نمبر ۲۳۱: لفظِ خالدون سے یہاں کیا مراد ہے اور خلد کے حوالے سے مصنف کی تقریر کا خلاصہ کیا ہے؟

جواب: یہاں خالدون سے مراد دائمون (ہمیشہ رہنے والے) ورنہ خلد تو لغت کے اعتبار سے ایک لمبی مدت ثابت رہنے کو کہتے ہیں چاہے اس میں دوام ہو یا نہ۔ اور چونکہ خَلَد میں مدت مدید کا معنی پایا جاتا ہے اس لیے چولہے پر رکھے جانے والے پتھروں اور تمام پتھروں کو خوالد کہا جاتا ہے کیونکہ یہ بھی عرصہ دراز تک باقی رہتے ہیں اسی طرح انسان کے قلب کو خلد کہتے ہیں کیونکہ یہ بھی جب تک انسان زندہ رہے باقی رہتا ہے۔ نیز اگر خلد دوام کے لیے ہوتا تو خالدين فيها میں ابداً کی قید لغو ہو جاتی کیونکہ خالدین سے ہی ابد کا معنی سمجھا جاتا ہے۔ نیز وقف مخلد (عرب طویل مدت ٹھہرنے کے لیے یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں) کو اگر بغیر دوام کے استعمال کیا جائے تو اس سے اشتراک یا مجاز لازم آئے گا اور اصل ان دونوں

کی نفی کرتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جب خلد میں دوام کا معنیٰ نہیں پایا جاتا تو پھر آپ نے اور جمہور مفسرین نے خالدون کی تفسیر دائمون سے کیوں کی۔ تو مفسر نے جواب دیا کہ دوام لفظ خــــالـدون سے نہیں سمجھا جا رہا بلکہ اس پر اور کئی آیات و احادیث دلالت کرتی ہیں کہ خلد سے دوام مراد ہے۔

سوال نمبر ۲۳۲: انسانی جسم میں انفکاک کے باوجود اس کا دوام کیسے ہوگا نیز خالدون کے ساتھ خوشخبری میں کیا حکمت ہے؟

جواب: انسانی بدن متضاد کیفیت والے اجزاء سے مرکب ہے اور اس میں تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں جس سے اس میں انفکاک پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے لیکن جنت میں ان کا دوام اس طرح ہوگا کہ اللہ عزوجل ابدان کا اعادہ اس طرح فرمائے گا کہ ان کے اجزاء متضاد کیفیت والے نہ ہوں بلکہ وہ ایک دوسرے کے متقاوم ہوں قوت میں برابر ہوں بعض، بعض پر قوی نہ ہوں کہ اس سے اس کا تغیر لازم آئے اور وہ اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملے ہوں گے کہ بعض، بعض سے جدا نہ ہوں گا۔ جس طرح کہ معادن (کانوں) میں اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے لہٰذا اُس عالم کو اِس عالم پر قیاس کرنا عقل کے نقص اور بصیرت کے ضعف کی وجہ سے ہے۔

خــــالـدون کے ساتھ خوشخبری دینے میں حکمت یہ ہے کہ بڑی بڑی لذات گھروں، کھانوں اور نکاحوں پر موقوف ہیں اور ان کا قائم رہنا، دوام اور ثبات سے ہوتا ہے کیونکہ بڑی سے بڑی نعمت کے بھی ہوا گر اس کے کا خوف ہو تو وہ نعمت ناپسندیدہ اور تکلیف والی ہو جاتی ہے اس وجہ سے دوام کے ساتھ مؤمنین کو خوشخبری دی گئی۔ نیز اس سے بہترین مثال بیان فرمائی اس کی جو آخرت میں ان کے لیے تیار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے بہتر انداز میں لطف اندوز ہوا جا سکے گا۔ نیز خلود کے وعدہ سے اس نعمت کے زوال کے

خوف کو زائل فرمایا تا کہ اس سے ان کو پتہ چل جائے کہ وہ کمال درجے کے سرور اور نعم میں ہوں گے۔

سوال نمبر ۲۳۴: ان اللہ لا یستحی الایۃ کا گذشتہ آیات سے تعلق کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بلند و بالا ذات کا مچھر وغیرہ کی مثال دینا کیسے صحیح ہوگا اس سلسلے میں مفسر کی تقریر نقل کریں کلامِ عرب میں اس قسم کی کوئی مثال ہے تو اس کا ذکر کریں؟

جواب: پہلی آیات تمثیل کی مختلف انواع کو متضمن ہیں تو اب اس آیت سے تمثیل کے حسن اور تمثیل کی شرط کو بیان فرمایا نیز جو تمثیل کا حق ہے اسے بیان فرمایا تمثیل کی شرط یہ ہے کہ ممثل؛ ممثل لہ کے موافق ہو بڑا ہونے میں اور چھوٹا ہونے میں اسی طرح گھٹیا اور عمدہ؛ ذلیل و شریف ہونے میں اس میں مُمَثِّل مثال دینے والے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ (پہلی آیت میں یہ فرمایا گیا فلا تجلعوا للہ اندادا' اب مچھر کی مثال ان انداد کے لیے بیان فرمائی گئی ان کی خساست کی وجہ سے)

رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کا یہ مثال بیان فرمانا کیسے درست ہوگا حالانکہ وہ بلند و بالا ذات ہے تو اس کا جواب جس طرح کہ پہلے بھی بیان ہو چکا یہ ہے کہ تمثیل میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ممثَّل، ممثَّل لہ کے موافق ہے یا نہیں' اس میں مثال دینے والے کو نہیں دیکھا جاتا اس لیے کہ ممثِّل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ممثَّل لہ کا معنی واضح ہو جائے نیز وہ اس طرح واضح ہو جائے جس طرح محسوس مبصر ہوتا ہے تا کہ جو چیز وہمی تھی وہ عقلی ہو جائے اور وہم عقل کے مساعد ہو جائے کیونکہ وہم محسوس صورتوں' حکایات وغیرہ کو پسند کرتا ہے۔ اسی وجہ سے کتب الٰہیہ میں اکثر مثالیں بیان ہوئی ہیں۔ اور کلام عرب میں حقیر چیزوں کی مثالیں دی جاتی ہیں جس طرح کہ کہا جاتا ہے کہ (اسمع من القراد) وہ بندر سے زیادہ سننے والا ہے۔ اعیش من الفراشۃ پروانے سے زیادہ عیش والا ہے اعزمن البعوض (مچھر کے مغز سے

بھی کم پایا جانے والا ہے وغیرہ)

سوال نمبر ۲۳۴: ان لا یستحیٰ الخ کفار کے طعن کا جواب ہے وہ طعن کیا ہے اور جواب کی نوعیت کیا ہے؟

جواب: جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حالت کی آگ روشن کرنے والوں اور بارش والوں کے ساتھ مثال بیان فرمائی نیز بتوں کے پجاریوں کی کمزوری اور ضعف میں مکڑی کے گھر کے ساتھ مثال بیان فرمائی اور ان کو مکھی سے کم درجہ قرار دیا تو جاہل کافروں طعن کیا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ مثالیں بیان فرمائے اور مکھی اور مکڑی (جیسی حقیر چیزوں) کا ذکر فرمائے اس طعن کے جواب کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مچھر کے ساتھ ضرب المثل کو اس آدمی کی طرح ترک نہیں فرماتا جو اس کی حقارت کے پیش نظر اس سے حیاء کرتے ہوئے اس کو ترک کر دے۔ اور رہی یہ بات کہ اللہ عزوجل بلند و بالا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں اور ان چیزوں کی مثال دینا اس کے منافی بھی نہیں کیونکہ مثال میں ممثل کو نہیں دیکھا جاتا ہے۔

سوال نمبر ۲۳۵: حیاء کا لغوی اور اصطلاحی معنی ذکر کریں اور بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں اگر نہیں تو پھر اس کا کیا مطلب ہوگا اس ضمن میں کچھ دیگر الفاظ سے مثالیں دیں؟

جواب: حیاء حیوۃ سے مشتق ہے کیونکہ یہ انکسار ہے جو قوۃ کو عارض ہو کر اسے اس کے افعال سے روک دیتا ہے۔ اور اصطلاح میں انقباض النفس عن القبیح ومخافۃ الذم (نفس کا قبیح قول یا فعل سے مذمت کے خوف سے رک جانا) اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا جائز ہے لیکن اس صورت میں اس کا معنی ترک کرنا ہوگا جو کہ انقباض کو لازم ہے (جب کوئی حیاء کرے کسی کام سے تو وہ اس سے رک جاتا ہے) جس طرح کہ رحمت رقت

قلبی کو کہتے ہیں لیکن جب اللہ عزوجل کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتو اس کا معنی نیکی و بدی پہنچانا ہوتا ہے کیونکہ یہ رقت قلبی کو لازم ہے۔اور غضب کا معنی ثوران النفس (نفس کا ہیجان اور جوش مارنا) ہے لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتو اس سے ثوران النفس کا لازم (ناپسندیدہ بات وضرر پہچانا) مراد ہوتا ہے۔اور حیاء سے انقباض جو کہ حیا کو لازم ہے مراد لینے کی نظیر شاعر کے اس قول میں ہے

اذا ما استحین الماء یعرض نفسہ کرعن بسبت فی اناء من الورد

شاعر اونٹ اور اس کے پاس کثیر پانی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب اونٹ پانی سے حیا کرتے ہیں یعنی پانی کو ترک کر دیتے ہیں تو وہ پانی اپنے آپ کو خود پیش کر دیتا ہے اور وہ اپنا منہ لگا کر ہونٹوں کے قریب پانی پی لیتے ہیں۔

سوال نمبر ۲۳۶: جب یہاں حیاء ترک کے معنی میں ہے تو پھر لفظ ترک کیوں ذکر نہیں کیا گیا؟

جواب: اس لیے کہ لفظ حیاء میں مبالغہ ہے اور اس میں تمثیل بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی کی طرح مچھر کی ضرب المثل بیان فرمانے کو ترک نہیں کرتا جو اس سے حیاء کرتا ہے۔

دوسرا احتمال آیت کریمہ میں یہ ہے کہ اس کو استعمال اس وجہ سے کیا گیا کہ کفار نے یہ کہا تھا اما یستحی رب الخ تو اس کے مقابلہ میں لفظ لا یستحی استعمال فرمایا گیا جس طرح کہ منافقین کے استہزاء کے مقابلہ میں اللہ یستھزیٔ فرمایا گیا۔

سوال نمبر ۲۳۷: ضربُ المثل کے حوالے سے مفسر کی وضاحت ذکر کیجئے؟

جواب: ضرب المثل 'ضرب الخاتم (مہر لگانے) سے بنا ہے۔اور لغت میں ضرب' آلہ قتل کے استعمال کو نیز آلہ قتل کو مضروب پر واقع کرنے کو کہتے ہیں پھر اس کا استعمال ان چیزوں میں ہونے لگا اس طرح کہ گویا کہ یہ اس میں حقیقت ہے پھر مثل بیان

کرنے کے لیے اس کا استعمال ہونے لگا۔

سوال نمبر ۲۳۸: ان یضرب کے محل کے بارے میں ائمہ نحو کے درمیان اختلاف کی نوعیت کیا ہے نیز مثلا ما میں ما کونسا ہے اگر اسے زائد مانا جائے تو قرآن کریم میں زوائد کے لزوم کا کیا جواب ہوگا؟

جواب: ان یضرب میں ان اپنے صلہ یضرب کے ساتھ مل کر محلا مجرور ہوگا امام خلیل کے نزدیک اس لیے کہ اس سے پہلے من جارہ مضمر ہے۔ جب کہ امام سیبویہ کے نزدیک یہ منصوب ہے اس لیے کہ من کے حذف کے بعد فعل (یستحی) اس کی طرف بنفسہٖ متعدی ہورہا ہے اور ایسی صورت میں یہ منصوب محلا ہوا کرتا ہے۔ مثلا ما میں ما ابہامیہ ہے جو کہ نکرہ (مثلا) میں ابہام کو زیادہ کرتا ہے۔ نیز اس میں عموم کو زیادہ کرتا ہے اور تقیید (مقید بنانے) کے راستے کو روک دیتا ہے۔ ما زائدہ ہے لیکن زائد سے مراد لغو اور بے کار نہیں کیونکہ قرآن کریم تمام کا تمام ہدایت ہے بلکہ زائد سے مراد وہ ہے جو معنیٰ مرادی کے لیے وضع نہ کیا گیا ہو بلکہ اس لیے وضع کیا گیا ہو کہ یہ اپنے غیر (دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر) کے ساتھ مذکور ہو اور اس میں قوت، مضبوطی پیدا کرے تو اس صورت میں ہدایت میں اضافہ کرتے ہیں نہ کہ یہ بے کار و لغو ہے۔ لہذا قرآن کریم میں زوائد کے استعمال پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

سوال نمبر ۲۳۹: بعوضۃ نحوی اعتبار سے کیا واقع ہورہا ہے تفصیلاً ذکر کریں؟

جواب: بعوضۃ۔ مثلا کا عطف بیان ہے یا یہ یضرب کا مفعول ہے اور مثلا اس سے حال واقع ہورہا ہے۔ اور حال کو ذوالحال سے مقدم اس لیے کیا گیا کہ ذوالحال (بعوضۃ) نکرہ ہے۔ یا یہ دونوں (مثلا اور بعوضۃ) یضرب کے مفعول ہیں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ضرب کے دو مفعول تو نہیں آتے اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت،

میں یہ جعل کے معنی کو متضمن ہوگا جو کہ متعدی بدو مفعول ہوتا ہے ایک قرأت میں بعوضۃ مرفوع پڑھا گیا ہے اس صورت میں یہ مبتدا کی خبر ہوگا۔ اس صورت میں مثلا ما میں ما کئی وجوہ کا احتمال رکھتا ہے یا تو یہ ما موصولہ ہوگا اور صدر صلہ محذوف ہوگا اور تقدیر عبارت یوں ہوگی ان یضرب مثلا الذی ھو بعوضۃ یا ما موصوفہ ہوگا اور اس کی صفت بعوضۃ ہوگی جس کا صلہ محذوف ہے جو کہ ھی ہے۔ اور ان دونوں صورتوں میں ما محلا منصوب ہوگا بدل ہونے کی وجہ سے کہ یہ مثلا سے بدل ہے یا یہ ما استفہامیہ ہوگا اور خود مبتدا ہوگا۔

سوال نمبر ۲۴۰: فما فوقھا کا محل کیا ہے اور فوق سے کیا مراد ہے دلائل کے ساتھ بیان کریں؟

جواب: فما فوقھا پر فاء عاطفہ ہے اور اس کا عطف یا تو بعوضۃ پر ہے یا ما پر (جب کہ ما کو اسمیہ قرار دیا جائے) ما فوقھا سے مراد یا تو جثہ (جسم) میں مافوق ہے جس طرح مکھی اور مکڑی یہ مچھر سے جسامت کے اعتبار سے بڑے ہیں اب آیہ کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مچھر کی مثال کو بیان فرمانے سے حیا نہیں فرماتا چہ جائے کہ اس چیز کو جو اس سے بڑی ہے یا فما فوقھا سے مراد صغر اور حقارت میں زیادتی ہے جس طرح کہ مچھر کے پر۔

مذکورہ دونوں احتمالوں کی دلیل یہ ہے کہ ایک شخص خیمے کی رسی سے الجھ کر گیا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ جس مسلمان کو بھی کوئی کانٹا چبھ جائے یا اس سے اوپر تو اس کے لیے اس کے بدلے میں ایک درجہ لکھ دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی ایک خطا مٹا دی جاتی ہے تو اس حدیث پاک میں فما فوقھا سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو شے تکلیف دینے میں کانٹے سے بڑھی ہوئی ہے جس طرح کہ گر جانا وغیرہ اور فما فوقھا یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہو جو چھوٹا ہونے میں کانٹے سے زائد ہو یعنی زیادہ چھوٹی ہو۔ جس طرح کہ چیونٹی کا کاٹ

لیا اور اس کی تائید سرکار دو عالم ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ (ترجمہ) مؤمن کو جو بھی ناپسندیدہ بات پیش آئے تو وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہے حتی کہ چیونٹی کا کاٹنا بھی۔

سوال نمبر ۲۴۱: فاما الذین امنوا الخ میں اما کے بارے میں تفصیل کیا ہے نیز اما پر فاء کونسا ہے اور یہاں کیسے داخل ہوا نیز یہ بھی بتائیں کہ ان دو جملوں کو ملانے سے کیا بات بتانا مقصود ہے؟

جواب: اما حرف تفصیل ہے اور ماقبل اجمال کی تفصیل کرتا ہے اور جس کا آغاز اس کے ساتھ ہو اس کی تاکید کرتا ہے یہ شرط کے معنی کو متضمن ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کے جواب پر فاء لائی جاتی ہے جس طرح کہ سیبویہ نے کہا اما زید فذاھب کا معنی یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہے زید جانے والا ہے یعنی اس نے ضرور جانا ہے۔ اور اس کا یہ پکا ارادہ ہے (اور فاء میں اصل تو یہ ہے کہ جملے پر داخل ہو کیونکہ وہی جزا ہوتا ہے لیکن اس طرح حرف شرط اور فاء اکھٹے ہو جائیں گے اور اہل عرب اس کو ناپسند کرتے ہیں لہذا اس کو خبر پر داخل کر دیتے ہیں اور شرط کی جگہ مبتدا لفظاً لے آتے ہیں ان دونوں کو لانے کا مقصد ایک تو مومنوں کے معاملہ کو اچھا محمود قرار دینا اور ان کے علم کو عند اللہ معتبر قرار دینا ہے۔ اور دوسرا کفار کے قول کی انتہائی مذمت کرنا ہے۔

سوال نمبر ۲۴۲: فاما الذین کفروا فیقولون ۔ یہاں فلا یعلمون کی بجائے یقولون لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: اس میں حکمت یہ ہے کہ کافروں کا ما ذا اراد اللہ الایہ کہنا ان کی مکمل جہالت پر واضح دلیل ہے اس لئے بطور کنایہ یقولون کا لفظ استعمال فرمایا تاکہ یہ ان کی جہالت پر دلیل کی طرح ہو جائے۔

سوال نمبر ۲۴۳: ماذا اراد اللہ الخ میں "ما" اور ذا کے بارے میں مفسر کی تقریر ذکر

کریں؟

جواب: یہ دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے ایک تو یہ کہ ما استفہامیہ ہو اور ذا الذی کے معنی میں ہو اور ذا کا مابعد (اراد اللہ) اس کا صلہ ہو اور یہ مجموعہ (موصول اور صلہ مل کر) ما کی خبر ہو۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ما' ذا کے ساتھ مل کر ایک اسم بنے ای شیء کے معنی میں تو یہ مفعولیت کی بنا پر محلاً منصوب ہوگا اور احسن بات یہ ہے کہ وجہ اول کی بنا پر ما مرفوع ہو اور وجہ ثانی کی بنا پر منصوب ہوتا کہ سوال کے مطابق ہو جائے۔

سوال نمبر ۲۴۴: ارادہ کسے کہتے ہیں تعریف ذکر کرنے کے بعد بتائیں کہ کیا یہ تعریف اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے یا نہیں اگر نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ پر اس کا اطلاق کس اعتبار سے ہوا؟

جواب: ارادہ کی تعریف یہ ہے نزوع النفس دلیلها الی الفعل بحیث یحملها علیه (نفس کا کھینچنا اور فعل کی طرف مائل ہونا اس طرح کہ وہ نفس کو فعل پر برانگیختہ کرے) اور ارادہ کبھی اس قوت کو بھی کہہ دیتے ہیں جو نزوع (اکساہٹ) کا مبدا ہے پہلے معنی کے اعتبار سے ارادہ فعل کے ساتھ ہوگا جب کہ دوسرے معنی کے اعتبار سے ارادہ فعل سے پہلے ہوگا۔ اور جب ارادہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اہلسنت کے مذہب کے مطابق اس کا معنی یہ ہوگا کہ دو مقدور (تحت القدرت) میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دینا اور اس کو ایک وجہ سے خاص کر دینا نہ کہ دوسری وجہ سے۔ یا یہ ایسا معنی ہوگا جو اس ترجیح کو واجب کر دے گا۔

سوال نمبر ۲۴۵: یضل به کثیرا ویهدی به کثیرا۔ اس آیت کے ضمن میں بتایئے کہ

(الف) اس کا محل نحوی کیا ہے (ب) مصدر کی جگہ فعل استعمال کرنے کی کیا وجہ ہے۔

(ج) دونوں گروہوں کو کثیر کہا گیا حالانکہ ایک کثیر ہو تو دوسرا قلیل ہوتا ہے تفصیلی جواب مطلوب ہے؟

جواب: (الف) یضل به الخ یہ ماذا اراد اللہ الخ کا جواب ہے۔ اور یہ مصدر کی

جگہ پر واقع ہے تقدیرِ عبارت اضلال کثیر و اھداء کثیر ہو گی۔

(ب) تو پھر مصدر کو ہی فعل کی جگہ کیوں نہیں لایا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فعل میں حدوث اور تجدد پایا جاتا ہے۔ (دوسرا نحوی احتمال یہ بھی ہے کہ پہلے دو جملوں کا بیان ہو وہ جملے جزاما کے ساتھ شروع کیے گئے)

(ج) ان دونوں گروہوں کو جو کثیر کہا گیا تو یہ ان کی ذوات کو دیکھتے ہوئے کہا گیا ہے ان کو ان کے مقابل کے اعتبار سے کثیر نہیں کہا گیا کیونکہ جو ہدایت یافتہ ہیں وہ قلیل ہیں۔ گمراہوں کی طرف نسبت کرتے ہوئے دوسرا احتمال (ان دونوں گروہوں کو کثیر کہنے کا) یہ ہے کہ ضالین کی کثرت ان کی تعداد کی اعتبار سے ہو اور ہدایت یافتہ حضرات کی کثرت فضل اور شرف کے اعتبار سے ہو۔ جس طرح کہ اس شعر میں ہے

ان الکرام کثیر فی البلاد وان قلوا کما غیرھم قل وان کثروا

کہ سخی لوگ کثیر ہیں (فضل و شرف کے اعتبار سے) اگر چہ وہ قلیل ہیں (تعداد کے اعتبار سے) اور ان کے غیر (کنجوس) قلیل ہیں (شرف و فضل کے اعتبار سے) اگر چہ وہ کثیر ہیں (تعداد کے اعتبار سے)

سوال نمبر ۲۴۶: فاسق کا لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کریں اور اس کے تین درجات کی وضاحت کریں نیز گناہ کبیرہ کا مرتکب اہلسنت کے نزدیک فاسق ہے۔ معتزلہ کا مذہب کیا ہے اور ان کی دلیل کیا ہے؟

جواب: فسق کا لغوی معنی الخروج عن القصد ہے یعنی اعتدال اور صراط مستقیم سے نکل جانا اور اصطلاح میں فاسق الخارج عن امر اللّٰہ بارتکاب الکبیرۃ (اللہ تعالیٰ کے امر سے نکلنے والا کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو کر) کو کہتے ہیں فاسق کے تین درجے ہیں۔

(۱) التغابی: وہ یہ ہے کہ فاسق کبیرہ گناہ کا مرتکب کبھی کبھی ہو اور اس کبیرہ کو برا سمجھے۔

(۲) الانہماک: وہ یہ ہے کہ انسان کبیرہ گناہ کا عادی ہو جائے اور اس کی پرواہ بھی نہ کرے۔
(۳) الجحود: وہ یہ ہے کہ انسان (فاسق) کبیرہ گناہ کا ارتکاب اس کو درست سمجھتے ہوئے کرے۔

معتزلہ فاسق کو نہ مومن سمجھتے ہیں اور نہ کافر اس لیے کہ یہ ایمان وکفر کی بعض صفات میں شریک ہیں۔

مثلاً مسلمانوں کے احکام میں اس طرح شریک ہیں کہ مناکحت اور توریث ان میں مابین المسلمین جاری ہوتی ہے ان کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے اور مسلمانوں کے قبرستان میں انہیں دفن کیا جاتا ہے اور کافروں کے ساتھ بعض احکام میں اس طرح شریک ہیں کہ شرکتِ عمل کی وجہ سے ان کی بھی مذمت کی جاتی ہے ان کو گمراہ قرار دیا جاتا ہے اور گواہی قبول نہیں کی جاتی وغیرہ۔

سوال نمبر ۲۴۷: الذین ینقضون عھدا اللہ: اس جملے کا پہلے جملے سے کیا تعلق ہے نقض کا لغوی معنی کیا ہے اور عہد توڑنے کو نقض سے کیوں تعبیر کیا گیا لفظ نقض کے ساتھ لفظ حبل کے استعمال اور اسکے ساتھ لفظ عہد کے استعمال میں کیا فرق ہے؟

جواب: یہ جملہ الفاسقین کی صفت ہے جو کہ مذمت اور ان کے فسق کو پختہ کرنے کے لیے ہے نقض کا لغوی معنی فسخ الترکیب (کسی شی کی ترکیب یعنی مرکب ہونے کو ختم کر دینا) اور یہ اصل میں رسی کے اجزاء کو متفرق کرنے کو کہتے ہیں اور ابطال عہد میں نقض کا استعمال بطور استعارہ ہوتا ہے کہ عہد کے لیے رسی کو مستعار لیا جاتا ہے کیونکہ عہد میں دو معاہدوں کے درمیان ربط و تعلق ہوتا ہے۔ اگر نقض کا استعمال حبل (رسی) کے ساتھ ہو تو یہ مجاز کے لیے ترشیح ہوگی یعنی اس بات کی طرف اشارہ ہوگا کہ یہاں نقض مجازاً مستعمل ہے اور اگر نقض کا عہد کے ساتھ استعمال ہو تو اس سے نقض کے توابع کی طرف اشارہ ہوگا جو یہ

ہے کہ عہد رسی کی طرح ہے کہ اس کے ذریعے متعاہدین کے درمیان وسیلہ قائم ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۲۴۸: عہد کیا ہوتا ہے اس کے مفہوم کی تائید میں صاحب تفسیر نے کچھ مثالیں ذکر کیں ان کی وضاحت کریں یہاں عہد سے کونسا عہد مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کے تین عہد کونسے ہیں؟

جواب: العہد الموثق عہد، میثاق، پیمان، وعدہ کو کہتے ہیں اور عہد اس چیز کے لیے وضع کیا گیا ہے جس کی رعایت کرنا مناسب ہے۔ جس طرح کہ وصیت اور یمین اور دار کو عہد کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی حفاظت کی جاتی ہے اس کی طرف لوٹنے کے ساتھ اور تاریخ کو عہد کہا جاتا ہے کیونکہ اس کو یاد دواور محفوظ کیا جاتا ہے۔

یہاں عہد سے مراد یا تو وہ عہد ہے جو عقل سے (یعنی عقل دے کر لیا گیا لہذا آیت تمام کفار کو شامل ہوگی) اور عقل وہ حجت ہے جو اللہ تعالیٰ کے بندوں پر قائم ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید اس کے واجب الوجود ہونے اور اس کے رسول ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتی ہے:۔(وعلیہ نزل قولہ تعالیٰ واشہدھم علی انفسہم) یا وہ عہد مراد ہے جو رسولوں سے لیا گیا یعنی رسولوں کو بھیج کر امتوں سے کہ جب ان کی طرف کوئی رسول جس کی تصدیق معجزات سے کی گئی ہو تشریف لائے تو اس کی تصدیق کرو اور اسکی اتباع کرو اور اس کے معاملے کو نہ چھپاؤ اور اس کے حکم کی مخالفت نہ کرو۔(والیہ اشار بقولہ واذ اخذ اللّٰہ میثا ق الذین اوتوا الکتاب) اللہ تعالیٰ کے تین عہد ہیں۔

(۱) وہ عہد جو اس نے تمام ذریت آدم علیہ السلام سے لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کریں۔

(۲) وہ عہد جو اس نے انبیاء کرام علیہم السلام سے لیا کہ وہ دین کو قائم کریں اور اس میں متفرق نہ ہوں۔

(۴) وہ عہد جو اس نے علماء سے لیا کہ وہ حق کو بیان کریں اس کو چھپائیں نہیں۔

سوال نمبر ۲۴۹: من بعد میثاقه: میں من کونسا ہے اور میثاق کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اس میں مـن ابتدائیہ ہے (کیونکہ ابتدائے نقض میثاق کے بعد تھی) اور میثاق اس چیز کا نام ہے جس کے ذریعے وثاقت (استحکام) پیدا ہو (اور آیت میں میثاق سے مراد یا تو وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے عہد کو پختہ فرمایا معجزات اور کتب کے ذریعے یا وہ ہے جسے لوگوں نے پختہ کیا التزام اور قبول کے ساتھ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مصدر کے معنی میں ہو۔

سوال نمبر ۲۵۰: اللہ تعالیٰ نے کس وصل کا حکم دیا جسے کافر لوگ کاٹتے ہیں اس وصل کی وضاحت کریں اور لفظ امر کے سلسلے میں مفسر کی تقریر ذکر کریں؟

جواب: قطع وصل سے مراد ہر وہ قطع ہے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے جس طرح کہ قطع رحم مومنین کی دوستی و مدد سے اعراض انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان فرق کرنا (ماننے کے اعتبار سے) اور کتب میں ماننے کے اعتبار سے فرق کرنا فرض جماعتوں کو چھوڑنا (جیسے صلوۃ جمعہ) وغیرہ الامر هـو القول الطالب للفعل امر وہ قول ہے جو فعل کو طلب کرنے والا ہو بعض نے کہا کہ اس کے ساتھ علو بھی پایا جائے یعنی آمر حقیقتاً بلند ہو بعض نے کہا کہ اس کے ساتھ استعلاء پایا جائے یعنی اگرچہ آمر بلند نہ ہو لیکن اپنے آپ کو بلند سمجھ کر فعل طلب کرے۔ اور اسی نام سے وہ امر بھی موسوم ہے جو امور کا واحد ہے جس طرح مفعول بہ مصدر کے ساتھ موسوم ہوتا ہے کیونکہ عمل یا شان بھی ان چیزوں میں سے ہے جس کا حکم دیا جائے چونکہ اس میں طلب فعل کا معنی پایا جاتا ہے اسی وجہ سے مامور بہ کو امر کہہ دیتے ہیں مفعول کا اس مصدر کے ساتھ نام رکھتے ہوئے۔

سوال نمبر ۲۵۱: فساد فی الارض سے کیا مراد ہے اور ان لوگوں کو کس قسم کے خسارے کا سامنا کرنا پڑا؟

جواب: اس سے مراد ایمان سے روکنا' حق کا مذاق اڑانا اور اس وصل کو قطع کرنا ہے جس سے عالم کا نظام اور اسکی صلاح قائم ہے۔ ان لوگوں نے نقصان اٹھایا کہ عقل کو غور و فکر کرنے سے معمل رکھا اور اس چیز کو حاصل نہ کیا جو ابدی حیوۃ کا انہیں فائدہ دیتی اور آیات پر ایمان لانے ان کے حقائق میں غور و فکر کرنے اور اس کے انوار سے حصہ حاصل کرنے کی بجائے انہوں نے آیات کریمہ کا انکار کیا اور اس میں طعن کیا۔ اور وفاء کے بدلے میں نقض' صلاح کے بدلے فساد اور ثواب کے بدلے میں عقاب مول لیا۔

سوال نمبر ۲۵۲: اتکفرون کی بجائے کیف تکفرون لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: کیف تکفرون میں اس حالت کی خبر طلب کی جارہی ہے جس پر کفر واقع ہوا کیونکہ کیف حالت کے بارے میں سوال کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اور کفر کے انکار میں اتکفرون سے زیادہ بلیغ اور زیادہ قوی ہے کیونکہ یہ اس دعوی کی طرح ہے جس کے ساتھ دلیل بھی ہو نیز اس کے بعد وکنتم امواتا الخ بعد میں حال آرہا ہے اس کے زیادہ موافق ہے کہ وہ بھی حالت ہے اور یہ کیف بھی حالت کی خبر کی طلب کے لیے ہے۔

سوال نمبر ۲۵۳: وکنتم امواتا سے ثم الیہ ترجعون تک حیات و موت کے مراحل مذکور ہیں۔ ان کی وضاحت کیجئے اور بتائیے کہ ان مراحل کا ذکر کرنے کا کیا مقصد ہے اور ان لوگوں کو کس بات کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے؟

جواب: کنتم امواتا پہلے تم ایسے اجسام تھے جن میں حیوۃ نہ تھی' عناصر' اغذیہ' اخلاط' نطفے اور گوشت کے لوتھڑے تھے بعض تام الاعضاء اور بعض غیر تام الاعضاء فاحیاکم پھر تمہیں زندہ کیا ارواح کی تخلیق کر کے اور ارواح کو تم میں پھونک کر ثم یمیتکم پھر تمہیں موت دے گا جب تمہاری مدتیں پوری ہو جائیں گی ثم یحییکم پھر تمہیں زندہ فرمائے گا اٹھانے اور پھیلانے کے ساتھ جس دن صور پھونکا جائے گا یا قبر میں سوال کے لیے اٹھائے جاؤ گے۔

ثم الیہ ترجعون پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے حشر کے بعد تو وہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزاء دے گا یا تم قبروں سے اس کی طرف اٹھائے جاؤ گے حساب کے لیے۔ ان مراحل کو ذکر فرما کر اس بات پر تنبیہ فرمائی کہ اللہ تعالٰی جب ان کو اولاً زندہ فرمانے پر قادر ہے تو دوبارہ بھی ان کو زندہ فرمانے پر قادر ہے کیونکہ ابتدائے خلق اعادے سے زیادہ آسان نہیں۔ نیز اس کا (ان مراحل کو ذکر کرنے کا) مقصد یہ ہے کہ جب تم اپنی حالت کو جانتے ہو تو پھر تمہارا کفر قابل تعجب ہے۔

سوال نمبر ۲۵۴: موت کو نعمت شمار کیا گیا اس کی کیا وجہ ہے نیز کیف تکفرون کے مخاطبین کے سلسلے میں کتنے اور کون کونسے اقوال ہیں۔

جواب: چونکہ موت حیات ثانیہ جو کہ حیات حقیقیہ ہے اسکی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہے اس لیے اسے نعمت شمار کیا گیا۔ کیف تکفرون کے مخاطبین کے سلسلے میں ایک قول تو یہ ہے کہ یہ خطاب کافروں سے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مومنوں اور کافروں دونوں سے خطاب ہو۔ (مومنوں سے خطاب کا مقصد ان سے صدور کفر کو بعید قرار دینا ہے)

سوال نمبر ۲۵۵: مفسر نے موت وحیات کی وضاحت کس انداز میں کی نیز اللہ تعالیٰ کے حیات سے موصوف ہونے کا کیا مفہوم ہے؟

جواب: حیات اصل میں قوت حساسہ کو کہتے ہیں یا اس چیز کو کہتے ہیں جو اس قوت کا تقاضا کرے لیکن اس کا استعمال مجازاً ان صورتوں میں ہوتا ہے کہ حیوان کو حیوان کہتے ہیں تو اس سے مراد قوت نامیہ (بڑھنے والی قوت) ہوتی ہے کیونکہ یہ قوت، قوت حساسہ کے اوائل مقدمات میں سے ہے۔ نیز انسان کے فضائل میں بھی حیات کا استعمال مجازاً ہوتا ہے جس طرح کہ علم، عقل، ایمان وغیرہ تو یہ اس حیثیت سے استعمال ہوتا ہے کہ یہ فضائل اس قوت حساسہ یعنی حیاۃ کا کمال اور غایت ہے۔

موت حیات کے مقابل ہے اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو موت کے مقابل ہو ہر مرتبہ میں (یعنی چاہے وہ حقیقت میں مستعمل ہو یا مجاز میں بہرصورت وہ حیات کی مقابل ہوگی) حقیقت میں موت کے استعمال کی مثال اللہ عزوجل کا ارشاد قل اللہ یحییکم ثم یمیتکم ہے اور مجاز میں استعمال کی مثال قولہ تعالیٰ اعلموا ان اللہ یحی الارض بعد موتھا اور اومن کان میتا فاحییناہ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کی ذات حیات سے متصف ہوتو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل کا علم وقدرت سے متصف ہونا صحیح ہے کیونکہ یہ اتصاف اس قوت (قوت حساسہ) کو لازم ہے۔ یا اس صورت میں ایسا معنی مراد ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور اس علم وقدرت کا تقاضا کرتا ہے تو یہ دونوں صورتیں بطور استعارہ (مجاز) ہوں گی۔

سوال نمبر ۲۵۶: ھو الذی خلق لکم ما فی الاض جمیعا: میں بیان کی گئی نعمت کا پہلی آیت میں مذکورہ نعمت سے کس قسم کا تعلق ہے اور لکم کی لام سے کیا مسئلہ ثابت ہورہا ہے؟

جواب: اس کا تعلق اس طرح ہے کہ پہلی نعمت یہ تھی کہ ان کی تخلیق اس حال میں ہو کہ وہ زندہ ہوں اور قدرت رکھنے والے ہوں (اور یہ احیاء بھی بار بار ہے) اور اس نعمت میں اس چیز کی تخلیق کا ذکر ہے جس پر انکی بقاء کا دارومدار ہے اور اس سے ان کی معاشی ضروریات مکمل ہوتی ہیں۔ لکم کی لام سے یہ مسئلہ ثابت ہورہا ہے کہ تمام اشیاء جو نفع مند ہیں وہ مباح ہیں۔

سوال نمبر ۲۵۷: کیا مضر اشیاء بھی مباح ہیں جب کہ آیت کے اطلاق سے یہی معلوم ہوتا ہے اسکا کیا جواب ہے؟

جواب: مضر اشیاء مباح نہیں کیونکہ لکم میں لام تعلیل اور انتفاع کا ہے یعنی تمہارے نفع کے لیے پیدا فرمایا جو کچھ زمین میں ہے۔ لہذا اشیاء نافعہ تو مباح ہوں گی جب کہ اشیاء نقصان دہ اس سے خارج ہوں گی۔

سوال نمبر ۲۵۸: استــواء کا لغوی اور اصطلاحی معنی ذکر کریں اور بتائیں کہ یہاں کونسا معنی مناسب ہے اور کیوں؟

جواب: استواء کا لغوی معنی طلب السواء (سواء' برابری' سیدھا پن کو طلب کرنا) ہے اور العدل فی الوصول الی المطلوب (مطلب و مقصود تک پہنچنے میں میانہ روی اختیار کرنا) کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں استـــواء اعتدال کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اجزاء کو برابر رکھا جاتا ہے۔ بعض نے کہا یہاں یہ معنی ہوگا کہ وہ والی اور مالک ہوا۔ لیکن یہاں قصد الیھا بارادته ((اس نے سماء کا قصد فرمایا اپنے ارادے سے) والا معنی زیادہ مناسب ہے اس کی چند وجہیں ہیں۔

(۱) یہ لغوی معنی کے زیادہ موافق ہے اس لیے کہ لغوی معنی طلب السواء ہے جس میں ارادے کے ساتھ موافقت ہے جب کہ استواء اور مِلک کی ارادہ کے ساتھ مناسبت نہیں۔

(۲) یہاں استویٰ کا صلہ اِلــی ہے جس کی وجہ سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس کا معنی ارادے والا لیا جائے کیونکہ ارادہ کا صلہ بھی اِلیٰ آتا ہے۔

(۳) اس کے بعد فسوھن ہے جس پر فاء داخل ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ تسویہ کا ترتب استواء پر ہے اور یہ بات تقاضا کرتی ہے کہ تسویہ استواء سے متاخر ہو اور تسویہ کا ارادے سے متاخر ہونا تو ظاہر ہے بخلاف استیلاء کے' لہذا اول معنی زیادہ موافق ہے۔ (یہ بطور استعارہ ہے) رہی بات اصطلاحی معنیٰ کی تو جب

استواءٗ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتو اصطلاحی معنی اعتدال مراد نہیں لے سکتے

کیونکہ یہ جسم کی صفت ہے اور اللہ عزوجل اس سے پاک ہے۔

سوال نمبر ۲۵۹: سماء سے کیا مراد ہے اور کیا ثــم اســتــوىٰ میں ثم تراخی کے لیے ہے اگر یہ

صورت ہے تو پھر والارض بعدذلك دحها کا مفہوم کیا ہوگا؟

جواب: السماء سے اجرام علویہ (وہ اجسام جو بلندی والی جہت میں ہیں) مراد ہیں یا اس

سے بلندی کی جہات مراد ہیں۔ ثم تراخی فی الوقت کے لیے نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ

والارض بعد ذلك دحها کے ظاہر کے مخالف ہوگا کیونکہ یہ آیت اس بات پر دلالت

کرتی ہے کہ زمین کا بچھانا (جو کہ اس چیز کی تخلیق سے مقدم ہے جو زمین کے اندر ہے) خلق

سماء سے متاخر ہے جب کہ ثم تراخی للوقت کے لیے ماننے کی صورت میں دحــو ارض کا

خلق سماء سے مقدم ہونا لازم آتا ہے لہذا یہاں ثم زمین و آسمان کی خلقت کے تفاوت کے

لیے ہے اور اس بات پر دلالت کرنے کے لیے کہ آسمان کے پیدا کرنے کو زمین کے پیدا

کرنے پر فضیلت حاصل ہے۔ لہذا ثم تراخی فی الرتبہ کے لیے ہوگا لیکن الارض سے پہلے

دوسرا فعل مقدر مانا جائے جیسے تعرَّف الارض وتدبر امرها اور دحاها کو متأنفہ

(نیا جملہ) قرار دیا جائے تو ثم تراخی وقت کے لیے ہوسکتا ہے۔ (لیکن بہر حال خلاف

ظاہر لازم آتا ہے)

سوال نمبر ۲۶۰: فسوّٰهن میں هن ضمیر کا مرجع کیا ہے اور اگر السماء ہے تو یہ ضمیر جمع

کیوں لائی گئی؟

جواب: اگر السماء کی تفسیر اجرام کے ساتھ کی جائے تو ضمیر کا مرجع السماء ہوگا کیونکہ یہ جمع

ہے یا جمع کے معنی میں ہے۔ اور اگر السماء کی تفسیر اجرام سے نہ کی جائے بلکہ اس سے

جہت علویہ مراد ہو تو هن ضمیر مبہم ہوگی (جس کا مرجع نہیں ہوگا) اور اس کی تفسیر اس کا مابعد

(سبع سموت) کرے گا جس طرح ربہ رجلا میں ہ ضمیر مبہم ہے جس کا کوئی مرجع نہیں اور اسکی تفسیر مابعد (رجلا) کر رہا ہے۔

سوال نمبر ۲۶۱: علم ہیئت کے مطابق نو آسمان ہیں جب کہ قرآنِ مجید میں سات کا ذکر ہے آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ علم ہیئت والوں کے نو آسمان والے قول میں شکوک وشبہات ہیں اور اگر اسے (نو آسمان) صحیح مان بھی لیا جائے تو آیت میں سات سے زائد کی نفی نہیں تیسرا جواب یہ ہے کہ جب سات آسمان کے ساتھ عرش وکرسی کو ملا دیا جائے تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

سوال نمبر ۲۶۲ وھو بکل شیء علیم کو مفسر علیہ الرحمۃ نے تعلیل قرار دے کر تفصیلی بحث کی ہے آپ اسے اس انداز میں ذکر کریں کہ مفسر کا مطلب بالکل واضح طور پر سامنے آ جائے؟

جواب: یہ آیت ماقبل کی تعلیل اس طرح ہے کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کیونکہ وہ تمام اشیاء کی حقیقت کا عالم ہے تو اس نے جو کچھ بھی پیدا فرمایا اسے اکمل طریقے اور انفع وجہ پر پیدا فرمایا کیونکہ جس کا فعل اس عجیب طریقے اور عمدہ ترتیب پر ہو تو وہ علیم ہوتا ہے اس لیے کہ افعال کو مضبوط کرنا اور ان کو بہترین صورت میں پیدا فرمانا یہ عالم، حکیم اور رحیم سے ہی متصور ہو سکتا ہے (نیز یہاں سے اس بات کو بھی زائل فرما دیا گیا جو کفار کے سینوں میں کھٹکتی تھی کہ بدن جب ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اور منتشر ہو جائیں گے تو دوبارہ ہر بدن کے اجزاء کو کس طرح جمع کیا جا سکتا ہے اس طرح کہ کوئی جزء رہ نہ جائے اور دوسرا کوئی جز اس سے مل نہ جائے جو اس کے ساتھ پہلے نہ تھا) تو جب وہ علیم ہے تو اس کے لیے یہ ناممکن نہیں۔

سوال نمبر ۲۶۳: واذ قال ربك الخ تیسری نعمت کا بیان ہے پہلی دو نعمتیں کون سی ہیں نیز

اس نعمت (نعمت ثالثہ) کی وضاحت کریں؟

جواب: پہلی نعمت ایجاد کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور زندہ رکھا دوسری نعمت ان چیزوں کو پیدا فرمانا ہے جو زمین میں ہیں اور تیسری نعمت اول الانبیاء علیہم السلام کو پیدا فرمانا اور ان کو عزت دینا ہے کہ آپ کو اور آپ کی ذریت کو ملائکہ سے افضل قرار دیا نیز تمام مخلوقات پر شرف بخشا۔

سوال نمبر ۲۶۴: لفظ اذ کے حوالے سے مفسر کی بحث اور اس میں اعتراض و جواب کی وضاحت کریں؟

جواب: اِذْ ظرف زمان ہے نسبت ماضیہ کے زمان کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ لیکن کبھی یہ مستقبل کے لیے بھی آ جاتا ہے جس طرح کہ اذا نسبت مستقبلہ کے زمان کے لیے وضع کیا گیا ہے اور کبھی یہ غیر نسبت مستقبلہ میں بھی استعمال ہوتا ہے اسی وجہ سے ان کی اضافت جملوں کی طرف ہوتی ہے۔ جس طرح کہ حیث جو کہ مکان کے لیے ہے اس کی اضافت بھی جملوں کی طرف ہوتی ہے۔ اور اذ اور اذا یہ دونوں موصولات کے ساتھ مشابہ ہونے کی وجہ سے مبنی ہیں اور یہ دونوں تعلیل (علت بیان کرنے کے لیے) اور مجازات (ایک دوسرے کو بدلہ دینے) کے لیے مستعمل ہیں اور یہ دونوں ہمیشہ محلاً منصوب ہوتے ہیں ظرفیت کی بنا پر کیونکہ یہ ظروف غیر منصرفہ ہیں۔

اعتراض: آپ نے کہا کہ اذ اور اذا ہمیشہ ظرفیت کی بنا پر منصوب محلاً ہوتے ہیں لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے ارشاد واذکر اخا عاد اذ انذر قومه الایہ وغیرہ میں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ اذکر کا مفعول ہو کیونکہ ذکر کا زمانہ انذار کا زمانہ نہیں بلکہ اذ مفعول بہ سے بدل ہے لہٰذا یہ مفعول بہ ہوا نہ کہ ظرفیت کی بنا پر منصوب۔

جواب: اصل میں اذکر الحادث اذکان کذا تھا پھر حادث کو حذف کر دیا گیا اور

ظرف اذ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا اور اس کا عامل آیت کریمہ میں قالوا یا اذکر ہوگا کیونکہ اذ قرآن کریم میں اذ کر کا معمول ہو کر کثیر مقامات پر آیا ہے یا اس کا عامل مضمر ہوگا جس پر پہلی آیت کا مضمون دلالت کرتا ہے جیسے بدا خلقکم اذ قال

سوال نمبر ۲۶۵: لفظِ ملائکۃ کی اصل اور اس کا بنیادی معنی بیان کریں نیز ملائکہ کو ملائکہ کیوں کہتے ہیں؟

جواب: مَلَائِکَۃٌ مَلْأَکٌ کی جمع ہے جس طرح کہ شَمَائِلُ شَمْئَلٌ کی جمع ہے اور اس میں تاء جمع کی تانیث کے لیے ہے اور مَأْلَکٌ سے مقلوب ہے جس کا معنی الرسالۃ ہے اور ملائکہ کو بھی ملائکہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے درمیان واسطے ہیں لہذا یہ رسل اللہ ہوئے یا لوگوں کی طرف پیغام رسان کی طرح ہوئے۔

سوال نمبر ۲۶۶: ملائکہ کی حقیقت میں اختلاف اور مختلف اقوال کی وضاحت مطلوب ہے نیز یہ بتائیں کہ ملائکہ کو کن دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

جواب: عقلاء کا ملائکہ کی حقیقت میں اختلاف ہے لیکن اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ یہ ایسی ذوات ہیں جو موجود ہیں اور اپنی ذاتوں کے ساتھ قائم ہیں۔ تو اکثر مسلمانوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ ایسے اجسام ہیں جو لطیف (غیر کثیف) ہیں اور مختلف شکلیں بدلنے پر قادر ہیں کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام انہیں مختلف شکلوں میں دیکھتے تھے۔

نصاریٰ کا ایک قول یہ ہے کہ یہ ایسے نفوس ہیں جو فضیلت رکھتے ہیں بشر ہیں اور بدنوں سے جدا ہونے والے ہیں جب کہ حکماء کا یہ گمان ہے کہ یہ ایسے جواہر ہیں جو مادہ سے خالی ہیں اور فی الحقیقت نفس ناطقہ کے مخالف ہیں۔ ملائکہ کی ایک قسم یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کی ایسی حالت ہے کہ ہر وقت حق تعالیٰ کی ذات مقدسہ میں منہمک و مستغرق رہتے ہیں اور غیر سے اعراض کیے ہوئے ہیں اور علیون ہیں (ملائکہ کی قسم کا نام ہے) اور ان کو ملائکہ

مقربین بھی کہا جاتا ہے۔اور دوسری قوم وہ ہے جو آسمان سے لے کر زمین تک تقدیر کے مطابق امور کی تدبیر کرتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور انہیں جو حکم دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں اور انہیں مدبّرات امر کہا جاتا ہے پھر ان میں سے بھی بعض سماویہ ہیں اور بعض ارضیہ۔

سوال نمبر۲۶۷: واذ قال ربك الخ میں مقول لہ فرشتوں کے بارے میں مفسر کی تقریر نقل کریں؟

جواب: مقول لہ فرشتے تمام کے تمام تھے بعض نے کہا کہ یہ ملائکة الارض تھے اور بعض نے کہا کہ ابلیس اور اس کے ساتھی تھے جو جنوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پہلے زمین میں ٹھہرایا تو انہوں نے فساد کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ابلیس کو ملائکہ کے ایک لشکر میں بھیجا تو انہوں نے جنوں کو تباہ و برباد کردیا اور جزائر اور پہاڑوں میں منتشر کردیا۔

سوال نمبر۲۶۸: لفظ جاعل کے حوالے سے مفسر علیہ الرحمۃ نے کیا توضیح کی ہے؟

جواب: جاعل' جعل سے بنا ہے جس کے دو مفعول ہوتے ہیں اور یہاں اس کے دو مفعول فی الارض اور خلیفة ہیں اور ان دونوں میں اس نے عمل کیا کیونکہ جاعل مستقبل کے معنی میں ہے اور مسند الیہ (انی) پر اس کا اعتماد ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ جاعل' خالق کے معنی میں ہو۔

سوال نمبر۲۶۹: خلیفہ کسے کہتے ہیں یہاں خلیفہ سے کون مراد ہے اور اللہ تعالیٰ نے خلیفہ کیوں بنایا جب کہ وہ محتاج نہیں ہے؟

جواب: خلیفہ اسے کہتے ہیں جو غیر کے پیچھے آ کر اس کا قائم مقام ہو اور خلیفہ میں ہاء گول تاء) مبالغہ کے لیے ہے اور اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی

زمین میں اس کے خلیفہ تھے اور اسی طرح ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کی تعمیر اور لوگوں کی سیاست میں خلیفہ بنایا نیز لوگوں کے نفوس کی تکمیل اور ان میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے نفاذ کے لیے انہیں خلیفہ بنایا گیا اللہ تعالیٰ کو اپنا قائم مقام و نائب بنانے کی حاجت نہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا نائب صرف اسی لیے بنایا کہ جن پر انہیں خلیفہ مقرر کیا گیا وہ اللہ تعالیٰ کے فیض اور اس کے امر کو (بغیر واسطہ کے) لینے سے قاصر تھے۔

سوال نمبر ۲۷۰: خلافت کے حوالے سے انسانوں میں انبیاءِ کرام علیہم السلام کے مقام کی عظمت ذکر کریں؟

جواب: کسی فرشتے کو نبی نہیں بنایا گیا بلکہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: (ترجمہ) اگر ہم کسی فرشتے کو نبی بناتے تو اسے بھی مرد بناتے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی قوت جب فائق ہوجاتی ہے اور ان کی روشنی اتنی مشتعل ہوجاتی ہے کہ قریب ہے کہ تیل روشن ہوجائے اگرچہ اسے آگ نہ چھوئے تو اللہ عزوجل نے ان کی طرف فرشتے بھیجے اور ان میں سے جو اعلیٰ رتبہ تھے ان سے اللہ تعالیٰ نے بغیر واسطہ کے کلام فرمایا جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے میقات میں اور حضور اکرم ﷺ سے لیلۃ المعراج میں کلام فرمایا۔

سوال نمبر ۲۷۱: اگر خلیفہ ایک سے زیادہ ہیں تو خلیفہ مفرد لانے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: خلیفہ ایک سے زائد ہیں لیکن یہ لفظ مفرد اس لیے لایا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر کی وجہ سے آپ کی اولاد کے ذکر سے استغناء حاصل ہوگیا جس طرح کہ قبیلہ کے باپ کا نام لینے سے قبیلہ کے نام کی ضرورت نہیں رہتی جس طرح مضر، ہاشم وغیرہ یا یہاں یہ تاویل ہوگی من یخلفکم (جو تمہارا خلیفہ بنے گا) یا خلقا یخلفکم (ایسی مخلوق بنانے والا ہوں جو تمہاری خلیفہ ہوگی) تو ان صورتوں میں مَنْ معناً جمع ہے اور خلق بھی اسم جمع ہے۔ لہٰذا تمام خلفاء (انبیاء کرام) اس میں داخل ہوگئے۔

سوال نمبر ۲۷۲: اللہ تعالیٰ نے تخلیق خلیفہ کے سلسلے میں فرشتوں کو کیوں مخاطب فرمایا ان کے سامنے اس بات کو ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: فرشتوں سے خطاب میں مقصود فرشتوں کو مشورہ لینے کی تعلیم دینا اور اس مجعول (حضرت آدم علیہ السلام) کی شان کی عظمت بیان کرنا تھا اس طرح کہ اس کے وجود کی خوشخبری عالم ملکوت کے ساکنین کو دی اور ان کو پیدا فرمانے سے پہلے ہی خلیفہ کا لقب دینا اور ان کی فضیلت کو ظاہر کرنا جو فضیلت راجح تھی اس پر جو اس میں مفاسد تھے۔ فرشتوں کے سوال اور اللہ عزوجل کے جواب کی صورت میں نیز یہ بات بتانا تھی کہ جس چیز میں خیر غالب ہو، حکمت اس کو ایجاد کرنے کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ خیر کثیر کو شر قلیل کی وجہ سے ترک کرنا یہ بھی شر کثیر ہے اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ ہیں۔

سوال نمبر ۲۷۳: تخلیق سے پہلے خلیفہ قرار دینا کیسے درست ہوگا؟

جواب: جس طرح کہ سوال نمبر ۲۷۲ میں تفصیلاً مذکورہ ہے کہ ان کی فضیلت کو ظاہر کرنا جو راجح ہے۔

سوال نمبر ۲۷۴: کیا فرشتوں کا اتجعل فیھا کہنا اللہ تعالیٰ پر اعتراض اور حضرت آدم علیہ السلام کی غیبت نہیں؟ اگر نہیں تو اس کی وضاحت کیجئے؟

جواب: یہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض اور حضرت آدم علیہ السلام کی غیبت نہیں بلکہ یہ تعجب کے طور پر تھا کہ زمین کی اصلاح اور اس کی تعمیر کے لیے ان کو خلیفہ بنایا جائے گا جو فساد کریں گے یا یہ کہ اہل طاعت کی جگہ اہل معصیت کو خلیفہ بنایا جا رہا ہے نیز جو حکمت ان پر مخفی تھی وہ اس کا کشف چاہتے تھے نیز اس بات کی خبر طلب کرنا چاہتے تھے جو ان کی راہنمائی کرے اور ان کے شبہ کو زائل کر دے جس طرح کہ متعلم اپنے معلم سے اس چیز کے بارے میں سوال کرتا ہے جو اس کے دل میں کھٹکے۔

سوال نمبر ۲۷۵: فرشتے معصوم ہیں اور انہوں نے محض ظن کی بنیاد پر آدم علیہ السلام پر طعن کیا جب کہ یہ عصمت کے خلاف ہے حشویہ فرقہ کے اس اعتراض کا کیا جواب ہے۔ فرشتوں کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ خون بہائیں گے اور فساد کریں گے؟

جواب: حشویہ فرقے نے یہ کہا تھا کہ فرشتوں نے محض گمان و تخمینے سے یہ کہا کہ یفسد فیھا ویسفك الدماء اس لیے کہ ان کو غیب کی خبر نہیں تھی۔ لہذا یہ غیبت ہوئی تو اس سے فرشتوں کا غیر معصوم ہونا ثابت ہو گیا۔ تو مفسر علیہ الرحمۃ نے اس کا جواب دیا کہ انہوں نے محض ظن، تخمینے سے یہ بات نہیں کہی تھی بلکہ یا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی خبر عطا فرمائی تھی یا انہوں نے لوحِ محفوظ سے اسے دیکھ لیا تھا یا ان کے دلوں میں یہ بات پختہ تھی کہ معصوم ہم ہی ہیں اس سے انہوں نے استنباط کیا تھا یا ثقلین (جن وانس) میں سے ایک کو دوسرے پر قیاس کر لیا تھا کیونکہ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جنوں نے زمین میں فساد کیا تھا۔

سوال نمبر ۲۷۶: لفظ سفك، سبك، سفح اور شن میں کیا فرق ہے؟

جواب: یہ تمام الفاظ صب (انڈیلنا) کی انواع و اقسام ہیں البتہ سفك خون اور آنسوؤں کے بہانے میں استعمال ہوتا ہے اور سبك پگھلائے ہوئے جواہر میں اور سفح اوپر سے نیچے کی طرف بہانے میں اور شن مشکیزے وغیرہ کے منہ سے بہانے میں مستعمل ہے۔ سن بھی اسی طرح ہے۔

سوال نمبر ۲۷۷: نحن نسبح بحمدك الخ کے حوالے سے مفسر علیہ الرحمہ کی تفصیلی گفتگو ذکر کریں؟

جواب: یہ جملہ حال ہے جو ماقبل اشکال کی وجہ کو پختہ کرنے والا ہے جس طرح کہا جاتا ہے ترجمہ: کیا تو اپنے دشمنوں پر احسان کرتا ہے حالانکہ میں تیرا دوست ہوں اور محتاج بھی ہوں اور آیت کا معنی یہ بنے گا کہ کیا تو گنہگاروں کو خلیفہ بنائے گا حالانکہ ہم معصوم ہیں اور خلافت

کے زیادہ حقدار ہیں اوراس سے مقصود اس چیز کے بارے میں استفسار تھا جس نے انسانوں کو خلیفہ بنانے میں فرشتوں پر ترجیح دی حالانکہ یہ خلافت فرشتوں کو دی جانی متوقع تھی اور تکبر اور تفاخر نہ تھا گویا کہ انہوں نے نے یہ جان لیا کہ مجعول (انسان) تین قوتوں والا ہے جس پر اس کے امر کا دارو مدار ہے۔ وہ قوتِ شہویہ اور غضبیہ ہے جو فساد اور خونریزی تک پہنچادیتی ہیں اور تیسری قوتِ عقلیہ ہے جو انسان کو معرفتِ باری تعالیٰ اور فرمانبرداری تک پہنچاتی ہے اب فرشتوں نے صرف قوت شہویہ وغضبیہ کو دیکھا یعنی ان قوتوں کو الگ الگ دیکھا اس کے مجموعے پر نظر نہ کی اور عرض کیا اس کو خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے تو وہ ان دو (غضبیہ، شہویہ) قوتوں کے اعتبار سے کہا، کہ حکمت تو اس کو وجود میں لانے کا بھی تقاضا نہیں کرتی چہ جائے کہ اس کو خلیفہ بنایا جائے رہی بات قوتِ عقلیہ کی تو ہم وہ چیز قائم کرتے ہیں جو اس قوت سے متوقع ہے اور یہ فعل فساد وغیرہ سے بھی سالم ہے لیکن انہوں نے ان دونوں قوتوں کی فضیلت کی طرف توجہ نہ کی کہ جب ان کو عقل کے مطابق مہذب بنادیا جائے، اور خیر پر عادی بنادیا جائے۔ جس طرح کہ عفت اور شجاعت، مجاھدۃ الھوی اور انصاف تو یہ ان دونوں قوتوں سے ہی پیدا ہوتے ہیں اور انہوں نے یہ نہ جانا کہ مرکب اس چیز کا فائدہ دیتا ہے جس سے اس کے اجزا بحیثیت انفرادی قاصر ہوتے ہیں لہذا ان تینوں قوتوں کا مجموعہ مفید ہے۔

سوال نمبر ۲۷۸: تسبیح وتقدیس کا معنی لکھیں اور دونوں میں فرق واضح کریں نیز بحمدك کا لفظ کس مقصد کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہاں تسبیح وتقدیس سے کیا مراد ہے؟

جواب: تسبیح کا معنی تبعید الله تعالیٰ عن السوء والنقصان (اللہ تعالیٰ سے برائی اور نقصان کو دور ماننا) اس سے ان چیزوں کی دوری کی نسبت کرنا۔ اور تقدیس بھی اسی طرح ہے اور تسبیح، سبح فی الارض والماء سے بنا ہے یعنی زمین اور پانی میں

چلا جائے اور دور ہو جائے اور تقدیس قدس فی الارض والماء سے بنا ہے اس کا بھی وہی معنی ہے یہ اور قدس کہا جاتا ہے جب کوئی پاک کرے کیونکہ شے کو پاک کرنے والا اس سے گندگی وغیرہ کو دور کرنے والا ہوتا ہے یہی ان کے (تسبیح وتقدیس کے) مابین فرق ہے چونکہ انہوں نے تسبیح کہا جس میں تسبیح وتقدیس کی نسبت ان کی طرف تھی تو اس سے خود پسندی اور فخر کا وہم ہوتا تھا اس لیے انہوں نے بجھک کہا کہ یہ تیری توفیق ہے جو تو نے اپنی معرفت کا ہم پر انعام فرمایا اس سے اس وہم کا تدارک ہو گیا یہاں تقدیس سے مراد یہ ہے کہ ہم اپنے نفوس کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں تیرے لیے اور تسبیح سے مراد یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو تیرا شریک ٹھہرانے سے پاک کرتے ہیں تیری رضا کی خاطر۔

سوال نمبر ۲۷۹: تعلیم کی تعریف کیا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کو اسمائے اشیاء کس انداز میں سکھائے گئے؟

جواب: تعلیم ایسا فعل ہے جس پر غالباً علم مرتب ہوتا ہے چونکہ یہ ہمیشہ نہیں ہوتا اسی لیے کہا جاتا ہے علمت فلم یتعلم میں نے اس کو سکھایا لیکن اس نے نہ سیکھا اور حضرت آدم علیہ السلام کو اسمائے اشیاء یا تو اس طرح سکھائے گئے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام میں ان اشیاء کا علم ضروری (جو نظر وفکر کے بغیر حاصل ہو) پیدا فرمایا یا آپ کے دل میں انکا القاء فرمایا اور وہ پہلے کی اصطلاح کے محتاج نہ تھے کہ تسلسل لازم آئے۔

سوال نمبر ۲۸۰: لفظ آدم مشتق ہے یا غیر مشتق اگر مشتق ہے تو مادہ اشتقاق اور مناسبت ذکر کریں اور مشتق نہیں تو کیوں؟

جواب: اسکے اشتقاق کے بارے میں اختلاف ہے۔ مفسر کے نزدیک غیر مشتق ہے کیونکہ یہ لفظ عجمی ہے تو اسے لفظ عربی سے مشتق ماننا خلاف ظاہر ہے اور جو اس کے اشتقاق کے قائل ہیں ان میں اختلاف ہے بعض اسے اُدمۃ سے مشتق مانتے ہیں جس کا معنی گندم گوں ہونا

ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کا رنگ گندمی تھا (واللہ اعلم) اس لیے آپ کو آدم کہا گیا یا یہ أدمۃ سے مشتق ہے جس کا معنی اسوہ نمونہ ہے چونکہ آپ باقیوں کے لیے نمونہ اور مقتداء تھے اس لیے آپ کو آدم کہا گیا یا ادیم الارض سے مشتق ہے اور ادیم الارض زمین کے اوپر والے حصے کو کہتے ہیں جو کہ مختلف رنگوں والا ہوتا ہے اور آدمی بھی مختلف رنگوں والے ہیں جو کہ آپ کی اولاد ہے اس لیے آپ کا نام آدم رکھا گیا۔ یا یہ الادم، الادمۃ بمعنی الفت سے بنا کیونکہ آدمی بھی دوسروں سے الفت و محبت کرتے ہیں اس لیے انہیں آدم کہا گیا۔

سوال نمبر ۱۲۸: لفظ اسم پر مفسر علیہ الرحمۃ کی بحث ذکر کریں اور بتائیں کہ یہاں اسم کا کونسا معنی مراد ہے؟

جواب: اسم اشتقاق کے اعتبار سے وہ ہے جو شے کی علامت ہو (علی مذہب الکوفیین) اور شی کی دلیل ہو اور اس شے کو الفاظ، صفت اور افعال کے اعتبار سے ذہن کی طرف اٹھائے جب کہ عرف میں اسم ایسے لفظ کے لیے مستعمل ہے جو وضع کیا گیا ہو کسی معنی کے لیے چاہے وہ مرکب ہو یا مفرد مخبر عنہ ہو یا خبر رابطہ اور اصطلاح میں اسم کا استعمال اس مفرد میں ہوتا ہے جو ایسے معنی پر دلالت کرتا ہو جو اس کی ذات میں پایا جاتا ہو (یعنی دوسرے کلمہ کو ملائے بغیر سمجھا جاتا ہو) اور تین زمانوں میں سے کسی کے ساتھ مقترن نہ ہو اور آیت کریمہ میں یا تو پہلا معنی (جو اشتقاق کے اعتبار سے سمجھا جاتا ہے) مراد ہے یا دوسرا معنی جو کہ عرفی معنی ہے اور دوسرا معنی بھی پہلے کو مستلزم ہے کیونکہ الفاظ کا علم دلالت کے اعتبار سے معانی کے علم پر موقوف ہے۔

سوال نمبر ۱۲۸۲: فرشتوں پر اسماء کو کیسے پیش کیا گیا اس سلسلے میں وضاحت کیجئے۔ اور یہ بھی بتائیں کہ جمع کی ضمیر (عرضھم میں ھم) لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: فرشتوں پر اسماء کو پیش کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان اسماء کے مسمیات (جن چیز وں کے وہ نام تھے ان کو) کو پیش کیا گیا۔ جمع کی ضمیر مذکر لانے میں حکمت یہ ہے کہ ان عقلاء کو غلبہ دیا گیا جن پر یہ نام مشتمل تھے۔

سوال نمبر ۲۸۳: فرشتوں سے اسماء کی خبر کا مطالبہ کس لیے تھا کیا یہ تکلیف مالا یطاق نہیں؟

جواب: یہ بطور تبکیت (الزام اور اسکات) کے لیے تھا اور اس بات پر تنبیہ کے لیے کہ وہ خلافت کے معاملے سے عاجز ہیں لہذا جب یہ تبکیت ہوئی تو تکلیف مالا یطاق بھی نہیں (جس طرح کسی کا غلام اس کا کہنا نہیں مانتا وہ اسے مارتا ہے لوگ اسے منع کرتے ہیں تو وہ لوگوں کو یہ دکھانے کیلیے کہ کیوں مارتا ہے اسے کسی چیز کا حکم دے تو مالک کا مقصود یہ نہیں کہ وہ یہ کام کرے بلکہ اس کا برعکس ہے تا کہ لوگ اسکی نافرمانی پر مطلع ہو جائیں)

سوال نمبر ۲۸۴: ان کنتم صدقین میں کس صدق کی طرف اشارہ ہے نیز فرشتوں کا وہ کونسا کلام ہے جس کی صداقت کا ذکر ہے؟

جواب: اس کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم اپنے اس گمان میں سچے ہو کہ خلافت کے تم حقدار ہو اپنی عصمت کی وجہ سے یا اس گمان میں کہ ان کو پیدا کرنا اور خلیفہ بنانا حکمت کے خلاف ہے کیونکہ ان کے یہ اوصاف ہیں کہ یفسد فیھا ویسفك الدماء اگرچہ فرشتوں نے اس کلام کی تصریح نہیں کی تھی لیکن ان کی گفتگو (اتجعل الخ) سے یہی لازم آتا ہے کیونکہ کسی سے صداقت کا طلب کرنا جس طرح اس کے کلام منطوق پر ہوتا ہے اسی طرح اس پر بھی ہوتا ہے جو اس کے مدلول سے لازم آئے۔

سوال نمبر ۲۸۵: سبحانك لا علم لنا الخ کے ذریعے فرشتوں نے کس بات کا اظہار کیا نیز لفظ سبحان کا معنی اور استعمال کی صورتیں بیان کریں؟

جواب: فرشتوں نے اپنے اس کلام سے عجز اور قصور (قاصر ہونے) کا اظہار کیا اور اس

بات کی خبر دی کہ ہمارا سوال بطور استفسار (وضاحت طلب کرنے اور اخفاء کو دور کرنے) کے لیے تھا نہ کہ اعتراض کے لیے نیز انسان کی فضیلت اور اس کو خلیفہ بنانے کی جو حکمت ان پر مخفی تھی وہ ظاہر ہوگئی تو اس پر انہوں شکر ادا کیا نیز تمام کا تمام علم اللہ تعالیٰ کی طرف سپرد کرنے میں ادب کی رعایت ہے اس لیے انہوں نے یہ کلام عرض کیا۔

سبحان غفران کی طرح مصدر ہے۔ یہ مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے اور اپنے فعل (سبحت) کے اضمار کی وجہ سے منصوب ہوتا ہے جس طرح کہ معاذ اللہ اعوذ فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور سبحان بطور علم غیر مضاف شاذ ہی استعمال ہوتا ہے جس طرح کہ سبحان من علقمۃ الفاخر یہاں یہ غیر منصرف ہے علیت اور الف نون زائدتان کی وجہ سے اور یہ شاذ ہے۔ یہاں (آیہ مبارکہ میں) سبحان بمعنی تسبیح (تنزیہ) کے مستعمل ہے۔

سوال نمبر ۲۸۶: انك انت العليم الحكيم میں انت ضمیر کے بارے میں مفسر علیہ الرحمۃ کی تقریر کی وضاحت مطلوب ہے؟

جواب: انت ضمیر منفصل ہے جو کہ انّ کے اسم اور خبر کے درمیان لائی گئی اور یہ ضمیر خبر اور صفت کے درمیان فرق کرنے کے لیے لائی جاتی ہے جب یہ ضمیر ہو تو اس کا مابعد صفت نہ ہوگا کیونکہ اگر صفت ہو تو یہ ضمیر موصوف بنے گی حالانکہ یہ بات ثابت ہے کہ ضمائر موصوف نہیں ہو سکتے۔

بعض نے یہ کہا کہ ضمیر انک کے کاف کی تاکید کے لیے ہے۔ جس طرح کہ کہنا مررت بك انت تو انمیں بھی انت کاف ضمیر کی تاکید ہے اور یہ معنی میں کان ضمیر کی تقریر کرتی ہے کیونکہ دونوں ضمیر خطاب کی ہیں اگر چہ انت ضمیر مرفوع اور بك میں کاف ضمیر مجرور محلا ہے اور تابع میں وہ چیز بھی جائز ہوتی ہے جو متبوع میں جائز نہ ہو اس وجہ سے

مــروت بـانـت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ ضمیر مرفوع ہے اور ضمیر منصوب کی جگہ نہیں آ سکتی
اس وجہ سے یاالرجل کہنا جائز نہیں جب کہ یاھذا الرجل کہنا جائز ہے۔ کیونکہ تابع میں
وہ چیز بھی جائز ہوتی ہے جو متبوع میں جائز نہ ہو۔

سوال نمبر ۲۸۷: قـال الـم اقـل لـكـم الخ اس آیت کا تعلق بتائیں اور اس آیت کے
ذریعے کن کن امور کی طرف اشارہ کیا گیا نیز فرشتوں نے کیا چھپایا اور کیا ظاہر کیا؟

جواب: پہلے اللہ عزجل نے فرمایا تھا اعـلـم مـالا تـعـلـمون میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں
جانتے اسی کو یہاں حاضر کیا جا رہا ہے اور اسے زیادہ شرح وبسط سے ذکر فرمایا تا کہ اس پر
حجت کی طرح ہو جائے کیونکہ اللہ عزوجل نے جب اس چیز کو جانا جو اُن پر مخفی تھی یعنی آسمان
وزمین کے امور اسی طرح جو اُن کے احوال ظاہرہ و باطنہ تھے انہیں جانا تو اس کو بھی جانا جو وہ
نہیں جانتے تھے نیز اس آیت میں فرشتوں کو ترکِ اولی پر عتاب کی تعریض ہے کہ وہ توقف
کرتے اور اس بات کا انتظار کرتے کہ ان کے لیے یہ بیان کر دیا جاتا مــا تبـدون سے
مراد فرشتوں کا قول اتـجـعـل فيها من يفسد فيها ہے اور مـا تكتمون سے مراد
فرشتوں کا اس بات کو چھپانا تھا کہ وہ خلافت کے حق دار ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے
افضل کسی مخلوق کو پیدا نہیں فرمایا بعض نے کہا کہ فرشتوں نے طاعت وفرمانبرداری کو ظاہر کیا
اور ان میں سے ابلیس نے نافرمانی کو چھپایا۔

سوال نمبر ۲۸۸: اس آیت کے مضامین کا خلاصہ اور جن امور کو اس آیت سے ثابت کیا گیا
ہے ان کا ذکر کیجئے؟

جواب: یہ آیات انسان کی فضیلت علم کی فضیلت اور علم کی عبادت پر فضیلت پر دلالت کرتی
ہیں اور اس بات پر کہ خلافت میں علم شرط ہے بلکہ عمدہ اور اصل ہے نیز تعلیم کی نسبت اللہ عز
وجل کی طرف درست ہے اگر چہ معلم کا اطلاق اس پر درست نہیں کیونکہ معلم اس خاص شخص

کے ساتھ خاص ہے جو اس کا پیشہ اختیار کرے۔ نیز یہ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ لغات تمام کی تمام توصیفیہ ہیں (یعنی انسان کا اس میں کوئی دخل نہیں) کیونکہ اسماء' الفاظ پر دلالت کرتے ہیں نصوص یا عموم کے ساتھ اور ظاہر ہے کہ یہ بات اس کا تقاضا کرتی ہے کہ اس سے پہلے وضع ہو اور اصل اس بات کی نفی کرتا ہے کہ یہ وضع حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے مخلوق سے ہو لہذا ثابت ہو گیا کہ یہ لغات اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہیں نیز اس آیت میں دلالت ہے اس بات پر کہ حکمت کا مفہوم علم کے مفہوم سے زائد ہے ورنہ انك انت العليم الحكيم میں تکرار ہو جائے گا (کیونکہ جب علم سے حکمت سمجھی جائے تو حکمت کا ذکر تکرار ہوگا)

سوال نمبر ۲۸۹: حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیوں کروایا گیا؟ نیز فاذا استویتہ ونفخت فیه من روحی فقعوا له سجدین سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کا حکم تسویہ آدم سے پہلے دیا گیا جب کہ اس جگہ تعلیم اسماء کے بعد کا ذکر ہے فرق بتائیں؟

جواب: تاکہ فرشتوں کو ان کی فضیلت کا اعتراف اور آپ کے حق کی ادائیگی ہو جائے نیز یہ اعتذار (عذر پیش کرنا) ہے اس سے جو انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں کہا اور تسویہ آدم سے پہلے سجدے کا حکم فرشتوں کے امتحان کے لیے اور حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کے اظہار کے لیے تھا لہذا سجدہ تعلیم اسماء کے بعد ہی کیا گیا پہلے امتحاناً فرمایا گیا کہ کون سجدہ کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔

سوال نمبر ۲۹۰: واذ قلنا کا عطف کس پر ہے اور اسے چوتھی نعمت قرار دیا گیا پہلی تین نعمتوں کی وضاحت کیجئے؟

جواب: اس کا عطف اذ قال ربك پر ہے یہ اس صورت میں ہے جب اذ کو فعل مضمر کی وجہ سے منصوب مانا جائے اگر فعل مضمر نہ مانا جائے تو پھر اس کا عطف اس اذکر پر ہوگا جو پہلے

جملے میں بطور عامل مقدر مانا گیا۔ بلکہ اس قصے کا عطف ماقبل قصے پر ہوگا۔ پہلی تین نعمتیں یہ تھیں۔

(۱) كيف تكفرون بالله وكنتم امواتا فاحياكم ثم يميتكم ثم يحييكم ثم اليه ترجعون میں مذکور ہے کیونکہ ان کو پیدا فرمانا' زندہ رکھنا' قدرت دینا یہ بڑی نعمت ہے۔

(۲) دوسری نعمت هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا الآیہ میں مذکور ہے کہ جس پر ان کی بقاء اور معاش کا دارومدار ہے اسے پیدا فرمایا۔

(۳) تیسری نعمت واذ قال ربك للملئكة الاية میں مذکور ہے۔ اور چوتھی نعمت واذ قلنا للملئكة الایۃ میں مذکور ہے کیونکہ خلقِ آدم اور ان کو خلیفہ بنانے کے ساتھ عزت بخشا اور ملائکہ کو سجدے کا حکم دے کر حضرت آدم علیہ السلام کو ان پر فضیلت دینا یہ ایسا انعام ہے جو آپ کی تمام ذرّیت کو عام و شامل ہے۔

سوال نمبر ۲۹۱: سجدہ کا لغوی اور شرعی معنیٰ ذکر کریں اور مامور بہ کونسا سجدہ تھا؟

جواب: سجدے کا لغوی معنیٰ تذلل مع التطامن جھکنے کے ساتھ عاجزی کا اظہار کرنا ہے۔ اور شرع میں وضع الجبهة علی قصد العباده (پیشانی کو عبادت کے ارادے سے رکھنا) سجدہ کہلاتا ہے۔

مامور به سجدہ یا شرعی معنیٰ والا تھا اس صورت میں مسجود له حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہوگا۔ اور آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدے کا قبلہ بنایا گیا ان کی عظمتِ شان بتانے کے لیے یا یہ کہ وہ وجوب سجدہ کا سبب تھے۔ یا مامور به سجدہ لغوی معنیٰ والا تھا اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے فرشتوں کی عاجزی کرنا بطور تعظیم اور بطور تحیۃ تھا۔ (جس طرح کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا ان کو سجدہ کرنا)

سوال نمبر۲۹۲: یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کو تھا یا اللہ تعالیٰ کو اور اگر حضرت آدم علیہ السلام کے لیے تھا تو غیر خدا کے لیے سجدہ کیسے جائز ہوگا؟ اور اگر اللہ تعالیٰ کے لیے تھا تو لادم کا کیا مطلب ہوگا؟

جواب: جس طرح کہ ماقبل سوال کے جواب میں تفصیلا بیان ہو چکا ہے کہ اس کے دونوں احتمال ہو سکتے ہیں اور اگر حضرت آدم علیہ السلام کے لیے سجدہ ہو تو یہ سجدہ تعظیمی تھا جو کہ جائز ہے نہ کہ سجدہ عبودیت جو کہ ناجائز ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ مانا جائے تو آدم علیہ السلام قبلہ ہوں گے۔ اور لادم میں بصورت ثانی لام' الی کے معنی میں اور بصورت اول سبب؟

سوال نمبر۲۹۳: جب سجدہ کا حکم فرشتوں کو تھا تو ابلیس کی استثناء کیسے صحیح ہوگی حالانکہ ابلیس ملائکہ میں سے نہیں اس سلسلے میں تفصیلی جواب مطلوب ہے؟

جواب: ابلیس فرشتوں میں سے ہی تھا لہذا استثناء درست ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے قول الا ابلیس کان من الجن (سوائے ابلیس کے کہ وہ جنوں میں سے تھا) سے اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ ابلیس فعل کے اعتبار سے تو جنوں میں سے تھا اور نوع کے اعتبار سے فرشتوں میں سے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہیکہ (ترجمہ) فرشتوں کی ایک قسم وہ ہے جن میں توالد وتناسل جاری ہوتا ہے ان کو جن کہا جاتا ہے اور ابلیس بھی انہیں میں سے ہے۔ جن حضرات کے نزدیک ابلیس ملائکہ میں سے نہ تھا وہ استثناء کے صحیح ہونے کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہ تھا تو جن لیکن فرشتوں کے درمیان پروان چڑھا اور فرشتے چونکہ اس کے مقابلے بہت زیادہ تھے اس لیے فرشتوں کو غلبہ دیتے ہوئے یہ حکم فرشتوں کو دیا گیا لہذا وہ بھی حکم میں داخل تھا۔ (جس طرح اقیموا میں بطور تغلیب مذکر کا صیغہ استعمال فرمایا گیا حالانکہ اقامت صلوۃ کا حکم عورتوں کو بھی

ہے)

یا یہ کہ ملائکہ کے ساتھ ابلیس کو بھی حکم دیا گیا تھا لیکن فرشتوں کے ذکر کرنے کی وجہ سے ابلیس کے ذکر سے استغناء حاصل ہو گیا جس طرح اکابر کو کسی کے لیے تذلل و عاجزی کا حکم ہو تو معلوم ہو جائے گا کہ اصاغر کو بھی حکم ہے۔

یا یہ کہ ملائکہ میں سے بعض وہ ہیں جو معصوم نہیں اگرچہ غالب ان میں معصومیت ہے جس طرح کہ انسانوں میں بعض معصوم ہیں اگرچہ غالب عدم معصومیت ہے۔

یا یہ کہ فرشتوں کی ایک قسم' شیاطین کے بالذات تو مخالف نہیں لیکن عوارض اور صفات کی وجہ سے مخالف ہے اور ابلیس بھی اسی قسم سے تھا۔

سوال نمبر۲۹۴: اباء اور استکبار کا مفہوم واضح کریں؟

جواب: اباء امتناع باختیار (اپنے اختیار سے رک جانا کسی فعل سے) کو کہتے ہیں اور تکبر یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دوسرے سے بڑا سمجھے اور استکبار میں چونکہ سین اور تا برائے طلب ہے اس لیے استکبار کا معنی طلب ذلك بالتشبع (کہ تکلف کے ساتھ اس کو طلب کرنا کہ میں دوسرے سے بڑا ہوں)

سوال نمبر۲۹۵: اگر ابلیس کو ملائکہ میں شمار کیا جائے تو ملائکہ کی معصومیت کے حوالے سے اعتراض اور جواب کیا ہوگا۔

جواب: سوال نمبر۲۹۳ میں تفصیلی جواب گزر چکا البتہ سوال یہ ہوگا کہ اگر ابلیس فرشتوں میں سے ہے تو فرشتے تو معصوم ہوں جبکہ ابلیس کا سجدہ نہ کرنا معصومیت کے خلاف ہے۔

سوال نمبر۲۹۶: فرشتوں کو نور سے اور ابلیس کو آگ سے پیدا کیا گیا اس کے باوجود ابلیس کو فرشتوں میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟

جواب: یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرشتے اور ابلیس مادے کے اعتبار سے متحد بالذات ہیں ہاں

صفات اور عوارض کی وجہ سے مختلف بالغیر ہیں لہذا نور سے مراد وہ جوہر ہے جو روشن ہو اور آگ میں بھی اسی طرح ہوتی ہے ہاں آگ میلی اور دھوئیں سے بھری ہوتی ہے اور اس کی شدت حرارت کی وجہ سے اس سے احتراز کیا جاتا ہے لیکن جب آگ بھی صاف ستھری کر دی جائے تو وہ بھی نور بن جاتی ہے لہذا النصوص میں کوئی تعارض نہیں۔

سوال نمبر ۲۹۷: اس آیت سے ثابت فوائد کا جائزہ پیش کریں؟

جواب: اس آیت سے یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں کہ استکبار بڑی بری شے ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کو مارنے پر ابھارا گیا اس کے راز میں غور وخوض کرنے سے رکنے کا اشارہ ملتا ہے نیز یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ امر وجوب کے لیے اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق کفر پر مرنا ہو (معاذ اللہ) وہ حقیقت میں بھی کافر ہے۔ کیونکہ اعتبار خاتمے کا ہوتا ہے اگر چہ حال کے اعتبار سے وہ مومن ہی کیوں نہ ہو۔ (یہ تنبیہ مواخاۃ ہے جو شیخ اشعری رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے)

سوال نمبر ۲۹۸: وقلنا یا ادم اسکن الایة (اقرؤا الایة الی آخره) میں انت ضمیر فصل کیوں لائی گئی صرف آدم علیہ السلام کو خطاب کیوں ہوا اور جنت سے کیا مراد ہے؟

جواب: قاعدہ ہے کہ ضمیر مستتر پر اسم ظاہر کا عطف درست نہیں اس لیے انت ضمیر لائی گئی (جس سے ضمیر مستتر کی تاکید ہو گئی) تاکہ زوجك کا عطف اس پر درست ہو جائے۔ اسکن میں صرف آدم علیہ السلام کو خطاب اس لیے کیا گیا تاکہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ حکم سے مقصود آپ ہی ہیں جنت سے مراد دار الثواب ہے کیونکہ الجنة پر لام عہد کا ہے اور معہود دار الثواب ہی ہے۔

سوال نمبر ۲۹۹: جنت اس وقت مخلوق ہو گئی تھی یا نہیں جو لوگ مخلوق نہیں مانتے ان کے نزدیک اس سے کیا مراد ہے اور وہ ہبوط کی کیا تاویل کرتے ہیں اور اس پر ان کی دلیل کیا

ہے؟

جواب: جنت اس وقت مخلوق ہوگئی تھی اور جولوگ اسے مخلوق نہیں مانتے وہ اس سے بستان (باغ) مراد لیتے ہیں جو کہ فلسطین کی زمین پر یا فارس اور کرمان کے درمیان تھا ان پر اعتراض ہوا کہ اللہ عزجل نے تو اھبطوا فرمایا جس کا معنی اوپر سے نیچے اترنا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ یہاں اھباط' انتقال کے معنی میں ہے یعنی اس باغ سے ھند کی زمین کی طرف منتقل ہو جاؤ اور اس پر انہوں نے دلیل دی کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اھبطوا مصرا میں آپ بھی ھبوط بمعنی انتقال لیتے ہیں۔

سوال نمبر ۳۰۰: جنت میں کشادگی کے ساتھ کھانے کی اجازت کی حکمت کیا تھی؟

جواب: اس میں حکمت یہ تھی کہ اگر چند درختوں میں سے کھانے کی اجازت ہوتی تو منہی عنہ درخت سے کھانے کا عذر پیش کیا جا سکتا تھا لیکن کشادگی کے ساتھ کھانے کی اجازت دیدی تو اب منہی عنہا درخت سے کھانے کا عذر ختم ہو گیا۔

سوال نمبر ۳۰۱: جب پھل کھانے سے روکنا مقصود تھا تو درخت کے قریب جانے سے ممانعت کی کیا وجہ ہے مصنف نے فرمایا اس میں کچھ مبالغات ہیں توضیح کیجئے نیز اس درخت سے کونسا درخت مراد ہے؟

جواب: چونکہ درخت کے قریب جانا اس میں سے کھانے کے مقدمات میں سے ہے لہذا اس درخت کی تحریم میں مبالغہ کرتے ہوئے اور اس سے بچنے کے وجوب میں مبالغہ کرتے ہوئے اس کے قریب بھی جانے سے منع کر دیا نیز اس میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ شے کے قریب ہونا اپنا میلان پیدا کر دیتا ہے جو دل کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے اور عقل وشرع کے مقتضی کے خلاف کام میں اسے مشغول کر دیتا ہے۔ (جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ حبک الشیء یعمی ویصم تیری کسی شے سے محبت تجھے محبوب کے عیب دیکھنے سے اندھا اور

محبوب کے عیب سننے سے بہرا) بنا دیتی ہے۔ درخت سے مراد یا تو گندم کا درخت تھا یا انگور کا یا زیتون کا یا ایسا درخت جس میں سے اگر کوئی کھائے تو بے وضو ہو جائے لیکن اولیٰ بات یہ ہے کہ درخت کی تعیین نہ کی جائے جس طرح کہ آیت میں تعیین نہیں کی گئی کیونکہ درخت کے نام جاننے پر مقصود موقوف نہیں۔

سوال نمبر۳۰۲: فازلھما الشیطان میں ازل سے کیا مراد ہے نیز زلت اور ازلال میں فرق واضح کریں اور بتائیں کہ شیطان نے ان کو پھسلانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟

جواب: اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ شیطان نے ان دونوں کو اس درخت سے پھسلا دیا اور اس درخت کے سبب ان کو پھسلنے پر ابھارا یا یہ مراد ہے کہ اس جنت سے پھسلا دیا یعنی ان دونوں کو وہاں سے نکلوا دیا ازلال اور زلت معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ البتہ زلت عثرت مع الزوال (لغزش مع زوال) کا تقاضا کرتی ہے۔

شیطان نے ان دونوں کو پھسلانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس نے کہا کیا میں تمہاری رہنمائی ایسے درخت کے بارے میں نہ کروں جس کے کھانے سے آپ ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور ہمیشہ کے لیے یہ ملک آپ کے ہاتھ آ جائے گا۔ نیز اس نے ان دونوں کے سامنے قسم اٹھاتے ہوئے یہ کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔"

سوال نمبر۳۰۳: جب شیطان کو جنت سے نکال دیا گیا تھا تو پھر اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو کس طرح لغزش میں ڈالا مختلف احتمالات کی وضاحت کریں؟

جواب: ابلیس نے کوئی شکل اختیار کر لی اور ان دونوں سے کلام کیا یا بطور وسوسہ ان کے دل میں یہ بات ڈال دی رہی یہ بات کہ اسے تو جنت سے نکال دیا گیا تھا پھر کس طرح داخل ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح وہ پہلے ملائکہ کے ساتھ عزت کے ساتھ جنت میں داخل ہوتا تھا اس سے اسے روک دیا گیا لیکن حضرت آدم و حوا علیہما السلام کی آزمائش کے لیے

اسے دخول سے نہیں روکا گیا یا یہ کہ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے ان دونوں کو آواز دی بعض نے کہا کہ وہ چوپائے کی صورت میں جنت میں داخل ہو گیا اور فرشتے اسے پہچان نہ سکے بعض نے کہا کہ وہ سانپ کے منہ میں داخل ہو گیا پھر جنت میں داخل ہو گیا بعض نے کہا کہ اس نے اپنے پیروکاروں کو بھیجا تھا اور انہوں نے ان کو پھسلا دیا والعلم عند اللہ تعالیٰ (یہ تمام احتمالات ہی ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے)

سوال نمبر ۳۰۴: اھبطوا جمع کا صیغہ استعمال کیا حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام حضرت حواء علیہا السلام دو تھے نیز بعضکم لبعض عدو کونسا جملہ ہے اور اس دشمنی کی کیا صورت تھی؟

جواب: جمع کی ضمیر اس لیے لائی گئی حالانکہ وہ دو تھے کہ وہ دونوں انسانوں کی اصل ہیں تو گویا تمام انسانوں کو خطاب ہوا یا جمع کے صیغے سے آپ دونوں اور ابلیس کو خطاب ہے۔ اس کو دوسری مرتبہ نکلنے کا حکم دیا کیونکہ پہلے وہ وسوسہ کے لیے داخل ہوتا تھا یا وہ چوری داخل ہوتا تھا یا اسے آسمان سے نکلنے کا حکم ہے۔

بعضکم لبعض عدو یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے اور اھبطوا کی ضمیر واؤ کی وجہ سے واؤ حالیہ کی ضرورت نہ رہی اس لیے ذکر نہ کی گئی۔ اور دشمنی اور عداوت کی صورت یہ تھی کہ بعض، بعض کی طرف گمراہی کی نسبت کر کے ان پر سرکشی کریں گے چاہے وہ گمراہ ہو یا نہ ہو۔

سوال نمبر ۳۰۵: حضرت آدم علیہ السلام کو آپ کے رب کی طرف سے جو کلمات حاصل ہوئے ان کی وضاحت کیجئے اور کلمات کی اصل بھی بتائیے؟

جواب: وہ کلمات ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخسرین تھے بعض نے کہا وہ کلمات سبحانک اللھم وبحمدک وتبارک

اسمك وتعالی جدك لا اله انت ظلمت نفسی فاغفرلی انه لا یغفر الذنوب الا انت تھے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی یا رب الم تخلقنی بیدك (اے میرے پروردگار کیا تو نے مجھے اپنے ید سے پیدا نہیں فرمایا) قال بلی (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیوں نہیں قال یا رب الم تنفخ فیّ الروح من الروحك (عرض کی اے میرے پروردگار کیا تو نے مجھ میں اپنی روح سے روح نہیں پھونکی) قال بلی (فرمایا کیوں نہیں) قال الم تسکنی جنتك (عرض کی کیا تو نے مجھے اپنی جنت میں نہ ٹھہرایا) قال بلی (فرمایا کیوں نہیں) قال یا رب ان تبت واصلحت ارجعی انت الی الجنة (عرض کی اے میرے پروردگار اگر میں توبہ کرلوں اور اصلاح کرلوں تو کیا تو مجھے جنت کی طرف واپس لے جائے گا) قال نعم (فرمایا ہاں) کلمہ کا لغوی معنی الکلم ہے اور اس کا معنی ایسی تاثیر ہے جس کا ادراک دو حالتوں (سمع و بصر) سے ہوسکتا ہے جس طرح کلام، جراحت، حرکت وغیرہ یہ ایسی تاثیر پیدا کرتے ہیں جس کا ادراک بھی حواس سے ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۳۰۶: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی اس کی کیا صورت تھی فتاب علیہ پر فاء کیوں لائی گئی نیز بتائیے کہ توبہ کی نسبت بندے اور اللہ تعالیٰ دونوں کی طرف ہوتی ہے فرق کیا ہے؟

جواب: اس کی صورت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر رحمت کے ساتھ رجوع فرمایا اور آپ کی توبہ قبول فرمائی فتاب پر فاء اس لیے لائی گئی کہ فتاب کا ترتب تلقی کلمات پر ہے اور تلقی کلمات اس توبہ کی قبولیت کو متضمن ہے اس لیے فاء ترتیبیہ لائی گئی۔

جب لفظ توبہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت لائی جائے تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سزا دینے سے بخشنے کی طرف رجوع فرمایا اور جب اس کے ساتھ بندہ موصوف ہو تو

اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ بندے نے گناہ سے رجوع کرلیا۔

سوال نمبر ۳۰۷: دوبارہ اھبطوا فرمانے میں کیا حکمت تھی مفسر علیہ الرحمۃ کی تقریر کی روشنی میں بتایئے؟

جواب: اس کی تکرار یا تو تاکید کے لیے ہے کہ پہلے اھبطوا کو اس نے مؤکد کردیا یا اس وجہ سے ہے کہ دونوں اھبطوا مقصد میں مختلف ہیں کیونکہ پہلا اھبطوا اس پر دلالت کرتا ہے کہ انہیں مصیبتوں کے گھر کی طرف اتارا گیا جس میں وہ ایک دوسرے سے دشمنی کریں گے اور اس میں ہمیشہ نہیں رہیں گے اور دوسرا اھبطوا اس بات کی طرف مشعر ہے کہ ان کو مکلف بنانے کیلیے اتارا گیا کہ جس نے ہدایت اختیار کی وہ نجات پا گیا اور جس نے ہدایت کو کھو دیا وہ ہلاک ہوگیا۔ نیز اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود تھا کہ وہ اترنا جس کے ساتھ دو چیزیں (دار فانی کی طرف اترنا اور باہم عداوت کرنا) متعلق ہیں وہ (اھباط) اکیلا ہی اس کے لیے کافی ہے کہ عقلمند آدمی اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے خوف کرے چہ جائے کہ جب اس کے ساتھ دوسرا اھباط (مکلف بنانا) بھی مقترن ہو لیکن حضرت آدم علیہ السلام سے نسیان سرزد ہوا اور ان کا یہ ارادہ نہ تھا نیز اس بات پر تنبیہ تھی کہ ان دونوں اھبطوا میں سے ہر ایک مستقل طور پر اس آدمی کے لیے بطور عبرت کافی ہے جو نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ رکھے۔ بعض نے کہا کہ پہلا اھبطوا جنت سے آسمان دنیا کی طرف اتارنے کے لیے تھا اور دوسرا اھبطوا آسمان دنیا سے زمین کی طرف اتارنے کیلیے۔ (لیکن یہ بات کمزور ہے)

سوال نمبر ۳۰۸: فاما یاتینکم منی ھذی اس جملے کی ترکیبی صورت کیا ہے اور ما زائدہ کس مقصد کے لیے ہے اور ان حرف شک کیوں لایا گیا جب کہ ہدایت کا آنا یقینی تھا نیز دوسری بار ضمیر کی بجائے لفظ ھدیٰ لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: شرط ثانی (فمن تبع ھدی) اپنے جواب (فلا خوف الایہ) سے مل کر پہلی شرط

(فاما یاتینکم الایہ) کا جواب ہے ما زائدہ کے ساتھ حرف اِن کی تاکید کی گئی (اسی وجہ سے فعل کو نون کے ساتھ مؤکد کرنا یہاں حسن ہے اگرچہ اس میں طلب کا معنی نہیں پایا جاتا) حرف شک کو اس لیے لایا گیا کہ فی نفسہ ہدایت کے آنے کا صرف احتمال تھا اور عقلاً اس کا آنا واجب نہیں۔ دوسری بار ضمیر کی جگہ لفظ ھدی لایا گیا (حالانکہ جب پہلے اسم ظاہر کا ذکر ہو جائے تو دوبارہ اس کی طرف ضمیر راجع کی جاتی ہے) اس لیے کہ دوسرے ھدی سے عام ہدایت کا ارادہ کیا گیا بنسبت پہلے ھدیٰ کے۔ اور عام سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ رسل کرام علیہم السلام لائے اور جس کا عقل تقاضا کرتی ہے۔ آیت سے مراد یہ ہے کہ جو کوئی اس کی پیروی کرے جو نبی لائے اس حال میں کہ وہ اس میں عقل کی رعایت کرنے والا ہو۔

سوال نمبر ۳۰۹: حزن اور خوف میں فرق واضح کریں اور ثواب کو بطور تاکید ثابت کرنے کی وضاحت کریں؟

جواب: حزن واقع چیز پر ہوتا ہے اور خوف متوقع پر (یعنی حزن گذشتہ زمانے یا حال میں فوت شدہ شے پر ہوتا ہے اور خوف زمانہ مستقبل میں کسی مصیبت وغیرہ پر) ثواب کو بطور تاکید ثابت کرنے کی وضاحت یہ ہے کہ عذاب تب ہوتا ہے جب گناہ کر لیا جائے اور گناہ کرنے والا گناہ کرتے وقت اس عذاب سے خوف کرتا ہے جس کی طرف یہ گناہ اسے لے جائے گا تو جب اللہ عزوجل نے ان سے اس خوف کی نفی فرمادی جو عذاب کے آنے کو لازم ہے تو لازم کی بھی نفی فرمادی اور لازم کی نفی ملزوم (عقاب) کی نفی سے ابلغ و اکد ہے لہذا جب عذاب کی نفی ہوگئی تو ثواب ابلغ و اکد طریقے سے ثابت ہو گیا۔

سوال نمبر ۳۱۰: والذین کفروا الایۃ اس جملے کا کس پر عطف ہے نیز کفر اور تکذیب دونوں کا ذکر کر کے کس بات کی طرف اشارہ کیا گیا؟

جواب: اسکا عطف فمن تبع الایۃ پر ہے کفر اور تکذیب کا ذکر فرما کر اس بات کی طرف

اشارہ کیا گیا ہے کہ کفر سے مراد اللہ تعالیٰ کا انکار ہے اور تکذیب سے مراد آیات کی تکذیب ہے یا یہ کہ آیات کا کفر دل سے ہے اور آیات کی تکذیب زبان سے کیونکہ تکذیب زبان سے ہوتی ہے اور انکار دل سے لہذا جس نے پیروی نہ کی بلکہ کفر و تکذیب کی تو فاولئك اصحب الجنة الاية اور یہ دونوں فعل متعلق اس بایاتنا کے ساتھ ہیں۔

سوال نمبر ۳۱۱: آیت کا لغوی معنی کیا ہے اس کا مادۂ اشتقاق بیان کریں اور آیاتِ قرآنیہ کو آیات کیوں کہتے ہیں وجہ بیان کیجئے نیز یہاں آیات سے کیا مراد ہے؟

جواب: آیت کا لغوی معنی علامتِ ظاہرہ ہے اور اسکا اشتقاق یا تو اَیّ سے ہے کیونکہ یہ بھی بعض کو بعض سے ممتاز و بیان کرتی ہیں اس لیے آیت کہتے ہیں یا یہ اوی سے مشتق ہے پھر اصل میں یہ اَیَیَۃٌ یا اَوَیَۃٌ سے ہوگی پھر اس کے عین کلمہ کو خلافِ قیاس الف سے بدلا گیا تو آیۃ ہوگیا یا یہ اَوَیَۃٌ سے ہے پھر واؤ کو الف سے بدلا گیا آیۃ ہوگیا یا یہ آئِیَۃٌ (قائلة کی طرح) تھا پھر ہمزہ کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا آیۃ ہوگیا۔

آیاتِ قرآنیہ کو آیات اس لیے کہتے ہیں کہ وہ آیات بھی الفاظ کا ایسا مجموعہ ہوتا ہے جو کسی فصل کی وجہ سے دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔ اور یہاں آیات سے مراد وہ آیات ہیں جو نازل کی گئیں یا عام معنی مراد ہے یعنی وہ علامات جو وجودِ صانع پر دلالت کرتی ہیں اور اس میں آیاتِ قرآنی بھی شامل ہوں گی۔

سوال نمبر ۳۱۲: اس آیت سے حشویہ فرقے نے کس بات کو ثابت کیا ان کی دلیل اور جواب تفصیلاً ذکر کریں؟

جواب: اس قصے سے حشویہ فرقہ نے انبیاء کرام علیہم السلام کی عدمِ عصمت پر کئی وجوہ سے استدلال کیا۔

(۱) آدم علیہ السلام نبی تھے اور انہوں نے منہی عنہ کا ارتکاب کیا اور منہی عنہ کا مرتکب

عاصی ہوتا ہے۔

(۲) منہی عنہ کے ارتکاب کی وجہ سے انہیں ظالمین سے بتایا گیا (معاذ اللہ) اور ظالم ملعون ہوتا ہے لقوله تعالیٰ الا لعنة اللّٰه علی الظٰلمین۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف عصیان اور غوی کی نسبت کی اور فرمایا وعصی آدم ربه فغوی

(۴) اللہ تعالیٰ نے آپ کو توبہ کی تلقین کی اور توبہ گناہ سے رجوع کرنے کو اور گناہ پر ندامت کو کہتے ہیں ۔

(۵) آپ نے خود اعتراف کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں نہ بخشے تو وہ خاسرین میں سے ہو جائیں گے اور خاسر کبیرہ گناہ والا ہوتا ہے اور مرتکب کبیرہ معصوم نہیں ہوتا۔

(۶) اگر وہ مذنب (گناہگار) نہ ہوتے تو ان پر یہ بات جاری نہ ہوتی جو جاری ہوئی۔

الجواب:

(۱) اس وقت وہ نبی نہ تھے لہٰذا یہ نبی کی عصمت کے یہ خلاف نہیں اور اگر آپ اس وقت بھی ان کو نبی مانتے ہیں تو اسکی دلیل دیں۔

(۲) یہ نہی تنزیہی تھی اور انہیں ظالم اور خاسر اس لیے کہا کہ انہوں نے ترک اولیٰ کے ساتھ اپنے حصے میں نقصان اٹھایا اور اپنے نفس پر زیادتی کی سوا اما اسناد الغی والعصیان الیه سیاتی بالجواب عنه فی موضعه انشاء اللّٰه تعالیٰ ان کو توبہ کا حکم مافات کی تلافی کے لیے تھا۔

اور ان پر جو کلام واحکام جاری فرمائے یہ ترک اولیٰ پر بطور عتاب تھا اور آپ کی تخلیق سے پہلے جو فرشتوں سے کہا تھا اس کو پورا کرنا تھا۔

(۳) آپ نے یہ فعل بھول کر کیا تھا لقوله تعالیٰ فنسی ولم نجد له عزما

لیکن آپ کو عتاب اس لیے کیا گیا کہ آپ نے اسباب نسیان کا تحفظ نہ کیا یا
نسیان امت سے تو معاف ہے لیکن انبیاء کرام سے نہیں کیونکہ ان کی قدر عظیم
ہے کما قال علیہ الصلوۃ والسلام اشد الناس بلاء الانبیاء ثم
الاولیاء ثم الامثل فالامثل

سوال نمبر ۳۱۳: ہماری طرف سے جواب کی ایک شق کہ حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے
آنا بطور مؤاخذہ نہ تھا اس پر اعتراض اور جواب کی وضاحت کریں؟

جواب: ہماری طرف سے جواب کی ایک شق یہ ہے کہ آپ کا جنت سے آنا بطور مؤاخذہ نہ تھا
بلکہ یہ اسی طرح ہے جس طرح کہ سبب پر مسبب مرتب ہوتا ہے تو آپ نے بھی بھول کر ہی
سبب کا ارتکاب کیا لیکن مسبب (جنت سے اترنا وغیرہ) اس پر مرتب ہو گیا۔ جس طرح کہ
جاہل (جو یہ نہیں جانتا کہ یہ زہر ہے) زہر کھا لے تو موت واقع ہو جاتی ہے کیونکہ زہر کھانا
موت کا سبب ہے اگرچہ اسے پتہ نہ تھا۔

اعتراض: آپ نے کہا کہ انہوں نے بھول کر سبب کا ارتکاب کیا حالانکہ یہ درست نہیں
کیونکہ شیطان نے ان کو کہا تھا کہ تمہارے رب نے تمہیں اس سے منع نہیں کیا اور اس نے قسم
بھی اٹھائی لہذا وہ بھولے کیسے؟

جواب: اس میں یہ دلالت تو نہیں کہ جب شیطان نے ان سے کہا اسی وقت انہوں نے کھایا
بلکہ ممکن ہے کہ عرصہ دراز کے بعد انہوں نے بھول کر کھایا ہو یا شیطان کی گفتگو نے ان کے
دل میں میلان طبعی پیدا کر دیا لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی رعایت کرتے ہوئے
اپنے آپ کو روکے رکھا یہاں تک کہ وہ بھول گئے اور مانع زائل ہو گیا اور طبیعت نے کھانے
پر ابھارا۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اجتہادی خطا کی وجہ سے

اقدام کیا کیونکہ آپ نے یہ گمان کیا کہ نہی تنزیہی ہے یا یہ کہ اس معین درخت سے کھانے سے منع کیا گیا لہٰذا آپ نے دوسرے درخت سے کھالیا جو اسی کی نوع سے تھا۔

سوال نمبر ۳۱۴: ممانعت کسی خاص درخت کی نہیں تھی بلکہ نوع کی تھی اس پر حدیث سے استشہاد پیش کیجئے؟

جواب: روی انہ علیہ الصلوۃ والسلام اخذ حریرا وذھبا بیدہ وقال ھذان حرام علی ذکور امتی حل لاناثھا۔

ترجمہ: نبی کریم ﷺ نے ریشم اور سونا اپنے دست مبارک میں پکڑا اور فرمایا یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں اور ان کی عورتوں پر حلال ہیں تو اس حدیث مبارک میں وہ خاص سونا اور ریشم جو آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک میں پکڑے ہوئے تھے کی حرمت مراد نہیں بلکہ اس کی نوع مراد ہے کہ کوئی بھی سونا اور کوئی بھی ریشم ہو اس کا وہی حکم ہے جو مذکور ہوا۔

سوال نمبر ۳۱۵: اس آیت سے چند امور ثابت ہوتے ہیں ان کی وضاحت کریں اور حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی حکمت ذکر کریں؟

جواب: اس کی حکمت یہ ہے کہ تا کہ معلوم ہو جائے کہ گناہ کرنا بڑا برا ہے اور اس سے آپ کی اولاد اپنے آپ کو بچائے نیز اس میں اور بھی حکمتیں ہیں اس آیت سے یہ امور ثابت ہوتے ہیں کہ جنت پیدا ہو چکی ہے اور وہ جہتِ عالیہ میں ہے نیز توبہ قبول ہوتی ہے ہدایت کی پیروی کرنے والا آگ کے دائمی عذاب سے محفوظ رہے گا اور کافر اس میں ہمیشہ رہے گا اور غیر کافر اس میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔

سوال نمبر ۳۱۶: یبنی اسرائیل الآیۃ کے لیے بنیادی امور جو مفسر علیہ الرحمۃ نے ذکر کیے ان کی وضاحت کیجئے یعنی یہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیوں کیا گیا؟

جواب: پہلے اللہ عزوجل نے توحید نبوت اور معاد کے دلائل ذکر فرمائے اور ان کی تاکید کے لیے مختلف نعمتوں کا ذکر اس کے بعد فرمایا کیونکہ وہ نعمتیں اس حیثیت سے کہ حادث ہیں محکم ہیں محدث (وجود میں لانے والے) حکیم پر دلالت کرتی ہیں جس کے لیے خلق وامر ہے وہ وحدہ لاشریک ہے اور اس حیثیت سے کہ ان کی خبر دینا جیسا کہ پہلی کتابوں میں بھی یہ ثابت شدہ ہے اس آدمی کی طرف سے جس نے ان کو نہ تو سیکھا اور نہ ان کی ممارست پیدا کی تو یہ غیب کی خبریں ہیں اور معجز ہیں اور مخبر عنھا کی نبوت پر دلالت کرتی ہیں یعنی نبی کریم ﷺ کی نبوت پر اور یہ نعمتیں اس حیثیت سے کہ انسان اور اس کے آباؤاجداد کی تخلیق کو شامل ہیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعادہ پر قادر ہے جس طرح کہ ان کو وجود میں لانے پر قادر ہے۔ اب بنی اسرائیل میں سے اہل علم واہل کتب کو خطاب فرمایا اور حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ان پر ہیں انہیں یاد کریں حق کی اتباع اور دلائل کی پیروی میں اپنے وعدے کو پورا کریں تاکہ وہ پہلے حضرات ہو جائیں جو نبی کریم ﷺ اور قرآن پر ایمان لائے۔

سوال نمبر ۱۳۷: لفظ ابن کا ماخذ اور معنوی مطابقت بیان کیجئے نیز اسرائیل کون ہیں اس لفظ کا معنی کیا ہے نیز اس کی لغت کے بارے میں مختلف اقوال پر روشنی ڈالیں؟

جواب: ابن بناء سے بنا ہے اور چونکہ یہ اپنے باپ کا مبنی (یعنی باپ اس کی بنیاد ہے) ہوتا ہے اس لیے اسے ابن کہتے ہیں۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے عبرانی زبان میں اس کا معنی صفوۃ اللہ ہے اور بعض نے کہا کہ اس کا معنی عبداللہ ہے ایک قراءت میں اسے اسرائل (یاء کو حذف کرکے) پڑھا گیا ہے اور ایک قراءت میں اسرال (یاء اور ہمزہ دونوں کو حذف کرکے) پڑھا گیا ہے اور ایک قراءت میں اسرائیل (ہمزہ کو یاء سے بدل کر) پڑھا گیا ہے۔

سوال نمبر ۳۱۸: بنی اسرائیل کو نعمتیں کیوں یاد دلائیں نیز یاد کرنے سے کیا مراد ہے اور اس سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کے زمانے کے یہودی ہیں یا ان کے آباؤ اجداد؟

جواب: نعمتوں کو یاد کرنے کا مطلب ان میں غور و فکر کرنا اور ان کا شکر ادا کرنا ہے اور ان کو نعمتیں اس لیے یاد دلائی گئیں کہ انسان طبعاً غیرت و حسد والا ہے تو جب وہ غیر کو دیکھتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے نعمتیں دی ہیں تو غیرت اور حسد اسے ناشکری پر برانگیختہ کرتی ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نعمتیں دی ہیں تو نعمت کی محبت اسے رضاء اور شکر پر ابھارے گی لہذا نعمتوں کا ان کے ساتھ تقیید اسی وجہ سے ہے کہ وہ شکر ادا کریں ناشکری نہ کریں اور شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایمان لے آئیں اور عمل صالح کریں۔
بعض نے کہا کہ اس سے مراد ان کے آباؤ اجداد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعون اور غرق ہونے سے بچا کر اور بچھڑے کی پوجا کو معاف فرما کر انعام فرمایا اور اس سے آپ ﷺ کے زمانے کے یہودی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے آپ ﷺ کا زمانہ پالیا اس سے بڑا انعام کیا ہو سکتا ہے؟

سوال نمبر ۳۱۹: اذکروا اور نعمتی کو اور کس طریقے سے پڑھا جاتا ہے مصنف علیہ الرحمۃ نے اس سلسلے میں کیا لکھا ہے؟

جواب: اذکروا کو ایک قراءت میں اِذَّکِرُوْا پڑھا گیا ہے اصل میں اذتکروا بروزن افتعلوا تھا چونکہ فاء کلمہ میں ذال واقع ہوئی تو تائے افتعال کو دال کیا اور اسی مناسبت سے ذال کو بھی دال کیا پھر دونوں دالوں کا ادغام کیا تو اِدَّکِرُوْا ہو گیا۔ اور نعمتی ایک قراءت یاء کے سکون کے ساتھ پڑھی گئی ہے حالت وقف میں اور ملا کر یاء کو التقائے ساکنین کی وجہ سے گرا کر پڑھا گیا ہے۔ اور یہ ان نحویوں کا مذہب ہے جو یاء ماقبل مکسور کو حرکت نہیں دیتے۔

سوال نمبر ۳۲۰: واوفوا بعھدی الایۃ دونوں جگہ لفظِ عہد کے بارے میں بتائیں کہ معاہد (اسم فاعل) کی طرف مضاف ہے یا معاہد (اسم مفعول) کی طرف نیز اللہ تعالیٰ کا عہد کیا ہے اور بنی اسرائیل کا عہد کیا ہے؟

جواب: بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ سے ایمان اور اطاعت کا عہد تھا اور اللہ تعالیٰ کا بنی اسرائیل سے اچھا ثواب عطا فرمانے کا۔ عہد دونوں (معاہِد ومعاہَد) کی طرف مضاف ہوسکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے عہد لیا ایمان اور عمل صالح کا' دلائل کو قائم فرما کر اور کتابیں اتار کر اور ان سے وعدہ فرمایا ان کی نیکیوں پر ثواب کا (اور دونوں طرف سے ایفاء عہد کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے کہ ہماری طرف سے ایفائے عہد کا پہلا مرتبہ شہادتین کے کلمے کو لانا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے خون اور مال کو محفوظ کرنا ہے اور اس کا آخری درجہ ہماری طرف سے بحر توحید میں اس طرح غرق ہوجانا ہے کہ اپنے نفس سے بھی غافل ہوجائے کسی دوسرے کی بات تو الگ رہی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایفائے عہد کا آخری درجہ دائمی وصل کے ساتھ ہمیں کامیاب کرنا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ تم میرا وعدہ پورا کرو نبی کریم ﷺ کی اتباع کر کے میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا تم سے بوجھ' اور مشقتوں وغیرہ کو اٹھا کر اور تم ایفاء کرو فرائض کی ادائیگی اور کبائر کے ترک کے ساتھ میں ایفاء فرماؤں گا مغفرت اور ثواب کے ساتھ تم ایفاء کرو صراط مستقیم پر استقامت کے ساتھ میں ایفاء کروں گا تمہیں عزت اور دائمی نعمت دے کر وغیرہ) بعض نے یہ کہا کہ بعھدی اور بعھدکم میں دونوں عہد مفعول کی طرف مضاف ہیں معنی یہ ہوگا کہ تم پورا کرو اس کو جو تم نے مجھ سے معاہدہ کیا ایمان اور التزام طاعت کا میں اس کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے معاہدہ فرمایا حسن اثابت (اچھا ثواب عطا کرنے) کا۔

سوال نمبر ۳۲۱: وایای فارھبون میں ایاک نعبد کی نسبت زیادہ تاکید ہے اس کی وجہ

بیان کریں اور فاء جزائیہ کیوں لائی گئی جب کہ شرط مذکور نہیں؟

جواب: اس میں ایاک نعبد کی نسبت زیادہ تاکید اس لیے ہے کہ اس میں ایک تو مفعول (ایای) مقدم ہے جو کہ حصر کا فائدہ دیتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس میں مفعول کا تکرار (فارھبون میں نون یعنی فارھبونی ہے) جب کہ ایاک نعبد میں فقط تقدیم مفعول ہے۔ یہ کلام چونکہ شرط کے معنی کو متضمن ہے گویا کہ کہا گیا ان کنتم راھبین شیئا لہذا فارھبون پر فاء لے آئے کیونکہ یہ جزاء کی طرح ہے۔

سوال نمبر ۳۲۲: وآمنوا بما انزلت مصدقا لما معکم الخ ایمان کا الگ ذکر کیوں کیا اور قرآن مجید کس اعتبار سے پہلی کتابوں کا مصدّق ہے تفصیلاً ذکر کریں؟

جواب: اس لیے کہ ایمان مقصود ہے کہ اور تمام وعدوں کو پورے کرنے میں سے ایمان کے وعدے کو پورا کرنا اہم ترین ہے اس لیے حکم دے کر اور اس پر ابھار کر اسے الگ لایا گیا۔ قرآن مجید پہلی کتابوں کا مصدّق اس طرح ہے اس میں ویسے ہی بیان کیا گیا جس طرح کہ پہلی کتابوں میں اس کی صفت بیان کی گئی یا قرآن مجید پہلی کتابوں کے موافق ہے قصص، مواعید (وعدے) توحید کی طرف بلانے، عبادت کا حکم دینے لوگوں کے درمیان عدل قائم کرنے گناہوں اور فواحش سے روکنے میں۔ البتہ یہ پہلی کتابوں کے احکام کے بعض جزئیات کے مخالف ہے اور یہ زمانے کی مصلحت کے پیش نظر ہے اور جن سے جس زمانے میں خطاب ہوا اس وقت کی رعایت کی جاتی ہے لہذا اس میں بھی کی گئی۔

سوال نمبر ۳۲۳: قرآن مجید اور پہلی کتابوں میں احکام کے اعتبار سے جزوی تفاوت کیوں ہے اور اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

جواب: یہ تفاوت زمانے کی مصلحتوں اور وقت کے تقاضوں کی بنا پر ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر پہلی کتابیں اس زمانے میں نازل ہوتیں تو یقیناً وہ قرآن مجید کے موافق نازل

ہوتیں (ان بعض جزوی احکام میں ورنہ تو ان کتابوں میں اصل کے اعتبار سے موافقت ہے) اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا

ترجمہ: "اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو میری ہی اتباع کرنی پڑتی"

اس سے معلوم ہوا کہ کتب مقدمہ کی اتباع قرآن مجید پر ایمان لانے کے منافی نہیں بلکہ اس پر ایمان لانے کو واجب کرتی ہے۔

سوال نمبر ۲۲۴: بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ وہ پہلے کافر نہ بنیں اس ضمن میں مصنف کی تقریر نیز مشرکین کے حوالے سے اعتراض و جواب کی وضاحت کیجئے؟

جواب: پہلے کافر نہ بننے سے مراد یہ ہے کہ تم پر ضروری ہے کہ تم اس پر پہلے ایمان لاؤ کیونکہ تم نے آپ ﷺ کے معجزات کو دیکھا اور آپ کی شان کا تمہیں (بنی اسرائیل کو) علم ہے اور تم آپ کے نام سے فتح طلب کرتے تھے اور آپ کے زمانے کی خوشخبری دیتے تھے اول کافر ضمیر جمع (لاتکونوا) کی خبر واقع ہو رہا ہے اور یہ اول فریق یا اول فوج کی تقدیر کے ساتھ ہوگا یا یہ تاویل ہوگی کہ تم میں سے کوئی بھی اس کا پہلا کافر نہ ہو جس طرح کہا جائے کسانا حلۃً اس نے ہمیں پوشاک پہنائی تو اس میں بھی کل واحد مراد ہیں۔

اعتراض: کسی شے سے شرعاً تب روکا جاتا ہے جب اس سے رکنا ممکن ہو جب کہ یہاں ایسا ممکن نہیں کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پہلے مکہ مکرمہ میں تھے تو وہاں پہلے کافر مشرکین عرب تھے جب آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو بنو نضیر و قریظہ کے یہودیوں نے پھر آپ کا کفر کیا اور باقی یہودیوں نے بھی ان کی اتباع کی تو یہ پہلے کافر تو نہ ہوئے چہ جائے کہ ان کو تقدم فی الکفر سے روکا جائے۔

جواب: یہاں نہی کی صورت میں جو کلام لایا گیا ہے اس سے مراد معنی حقیقی نہیں اور معنی حقیقی مراد ہونے کی صورت میں آپ کا اعتراض وارد ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد تعریض ہے (یعنی

کلام کو ایک طرف مائل کرنا) اور تعریض اس طرح ہے کہ ولاتکونوا اول کافر سے مراد
یہ ہے کہ ضروری ہے کہ تم ان پر پہلے ایمان لانے والے ہو جاؤ کیونکہ تم ان کو پہچانتے ہو اور
ان کی صفت کو بھی پہچانتے ہو کیونکہ دونوں چیزیں تورات میں مذکور ہیں اور اگر یہ مان لیں
کہ یہاں آیت کا ظاہری معنی مراد ہے تو اب آیت کا معنی یہ ہو گا کہ اہل کتاب میں سے تم
اس کے پہلے کافر نہ ہو جاؤ یا ان میں سے پہلے کافر نہ ہو جاؤ جو قرآن کے منکر ہوئے کیونکہ
جس نے قرآن کا انکار کیا اس نے اس کا انکار کیا جس کی قرآن کریم تصدیق کر رہا ہے یا یہ
مراد ہے کہ ان آدمیوں کی طرح اول کافر نہ ہو جاؤ جو مشرکین مکہ میں سے اول کافر ہوئے۔

سوال نمبر ۳۲۵: لفظ اول کے بارے میں مصنف کی تحقیق سپردِ قلم کریں؟

جواب: لفظ اول افعل کے وزن پر ہے اس کا کوئی فعل نہیں بعض نے کہا کہ اس کی اصل
اَوْءَ لُ ہے جو کہ وَأَلَ سے ماخوذ ہے پھر اس کے ہمزے کو خلاف قیاس تخفیف کے لیے واؤ
سے بدل دیا پھر واؤ کا واؤ میں ادغام کیا تو اول ہو گیا بعض نے کہا اس کی اصل أءْ وَل تھی جو
کہ آل سے ہے پھر دوسرے ہمزہ کو واؤ سے بدل دیا اور پھر واؤ میں ادغام کر دیا گیا تو اول
ہو گیا۔

سوال نمبر ۳۲۶: ولا تشتروا بایاتی ثمنا قلیلا: مفسر علیہ الرحمۃ نے خریدنے کو بدلنے
سے تعبیر کیا اس کی وجہ کیا ہے نیز ثمن کے ساتھ قلیل کی صفت سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ زیادہ
قیمت پر آیات بدلنا جائز ہے آپ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: پہلے یہ بات بیان ہو چکی کہ اشتراء اصل میں بذل الثمن لتحصیل ما
یطلب من العیان (ثمن کو خرچ کرنا اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے جو اعیان میں
سے طلب کی جاتی ہے) ہے اس لیے ضروری ہے کہ عوضین مال متقوم ہوں یہاں عوضین مال
ہی نہیں چہ جائے کہ مال متقوم ہوں لہذا یہاں کلام حقیقت پر نہیں بلکہ بطور استعارہ ہے کہ جو

چیز ان کے ہاتھ میں تھی یعنی آیات پر ایمان اس کو انہوں نے خرچ کر دیا اور اس سے اعراض کر کے دنیا کے مال و دولت کو حاصل کیا اس کو تشبیہ دی گئی مبیع کو ثمن خرچ کر کے حاصل کرنے کے ساتھ پھر لفظ اشتراء استبدال کے لیے مستعار لیا گیا۔ قلیل کی صفت سے یہ شبہ پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ثمن اگر زیادہ بھی ہوں تو پھر بھی آخرت کے حصوں کی طرف نسبت کرتے ہوئے قلیل اور گھٹیا ہیں۔

سوال نمبر ۳۲۷: رسول اکرم رحمت دو عالم ﷺ کی اتباع سے ان لوگوں کو رکاوٹ کیوں ہوئی اس سلسلے میں مصنف کے بیان کردہ اقوال کی وضاحت کریں؟

جواب: بعض نے کہا کہ ان کی اپنی قوم میں سرداری تھی اور ان سے تحفے تحائف ملتے تھے اب انہیں خوف ہوا کہ اگر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی تو یہ چیزیں ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ لہذا انہوں اس سرداری و تحائف کو اتباع پر ترجیح دی۔ بعض نے یہ کہا کہ وہ رشوت لیتے تھے پھر حق کو بدل دیتے اور اس کو چھپاتے اب انہیں خوف ہوا کہ اتباع رسول اللہ ﷺ کی صورت میں وہ ان چیزوں سے محروم ہو جائیں گے۔ یہی چیز ایمان لانے میں ان کے لیے بڑی رکاوٹ تھی۔

سوال نمبر ۳۲۸: تقویٰ کے لیے کن امور کو اختیار کرنے کے ساتھ تفسیر کی گئی نیز رھبة اور تقویٰ میں کیا فرق ہے؟ نیز رھبة کو پہلے اور تقویٰ کو بعد میں لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: ایمان، اتباع حق اور دنیا سے اعراض کرنے کے ساتھ تقویٰ کی تفسیر کی گئی۔ پہلی آیت (یا بنی اسرائیل الی فارھبون) ان چیزوں پر مشتمل ہے جو مبادی کی طرح ہیں ان چیزوں کے لیے جو دوسری آیت (وآمنوا بما انزلت الی فاتقون) میں ہیں اس لیے پہلے رھبة کو اور پھر بعد میں تقوی کو لایا گیا نیز پہلی آیت میں خطاب ہر عالم و مقلد کو شامل ہے اس لیے اس میں رھبة کا حکم دیا گیا کیونکہ رھبة سلوک کی ابتداء ہے اور دوسری

آیت میں خطاب اہل علم کے ساتھ خاص ہے اس لیے ان کو تقوی کا حکم دیا گیا جو کہ سلوک کی انتہاء ہے اس سے تقوی اور رھبۃ میں فرق معلوم ہو گیا۔

سوال نمبر ۳۲۹: حق کو باطل کے ساتھ ملانے کا کیا مطلب ہے اور تکتموا مجزوم ہے یا منصوب دونوں صورتوں میں لفظی اور معنوی وضاحت کریں؟

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حق نازل ہوا اس کو اس باطل کے ساتھ نہ ملاؤ جس کو تم اپنی طرف سے گھڑتے ہو اور چھپاتے ہو تاکہ ان دونوں کے درمیان کوئی تمیز نہ رہے یا یہ مطلب ہے کہ تم حق کو باطل میں خلط ملط کرنے سے ملتبس نہ کرو وہ باطل جس کو تم حق کے درمیان لکھتے ہو یا وہ باطل جس کا ذکر تم حق کی تاویل میں کرتے ہو۔ تکتموا جب مجزوم مانا جائے تو اس صورت میں نہی کے حکم میں داخل ہوگا (وہ نہی جو لا تلبسوا میں ہے) تو گویا کہ انہیں ایمان لانے اور گمراہی چھوڑنے کا حکم دیا گیا اور گمراہ کرنے سے منع کیا گیا وہ اس طرح گمراہ کرتے تھے کہ جس نے حق کو سنا ہوا اس کو دھوکا دے کر حق اور باطل کو ملتبس کر دیتے اور جس نے حق کو نہیں سنا اس سے حق چھپائے رکھتے۔

یا تکتموا منصوب ہے اس صورت میں یہ اَنْ کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا اس بنا پر کہ وتکتموا میں واؤ جمع کے لیے ہوگی معنی یہ ہوگا کہ تم نہ جمع کرو حق کو باطل کے ساتھ ملانے اور اس کو چھپانے کو اس کی تائید حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف سے بھی ہوتی ہے کہ اس میں وتکتمون ہے اور مبتدا محذوف ہوگا اور تقدیر عبارت وانتم تکتمون ہوگی اور یہ حال ہوگا کاتمین کے معنی میں اور چونکہ حال اور ذوالحال کے عامل میں مقارنت ہوتی ہے لہذا یہاں بھی جمعیت والا معنی پایا جائے گا کہ لبس حق بالباطل اور کتمان الحق کو جمع نہ کرو۔

سوال نمبر ۳۳۰: واقیموا الصلوۃ الخ کی روشنی میں بتائیں کہ کیا کفار کو شرائع اسلام کا

خطاب ہوسکتا ہے؟ اگر نہیں تو یہاں کیوں ہوا؟ تفصیلی جواب مطلوب ہے؟

جواب: علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ کے کلام کے مطابق کفار کو شرائع اسلام کا خطاب ہوتا ہے لیکن تقدیم ایمان کے ساتھ کہ پہلے ایمان لاؤ پھر نماز ادا کرو۔ اور اسی کی طرف امام شافعی رحمہ اللہ اور عراقی گئے ہیں جب کہ ماوراء النہر کے مشائخ کرام رحمہم اللہ کے نزدیک کافر اس کے مخاطب نہیں ہیں۔ اور یہی مذھب قاضی ابوزید شمس الائمہ فخر الاسلام رحمہم اللہ کا ہے اور متاخرین کا بھی مختار ہے اور ان کے نزدیک آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ ان (اقیموا الصلوۃ) کا معنی ہے کہ نماز کی فرضیت کا اعتقاد رکھو اور ان کی تکلیف کو قبول کرو امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ جو اس بات کو جائز قرار دیتے ہیں کہ کفار کو فروع اسلام کا خطاب درست ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت سے مراد ہوگی کہ نماز جو معروف ہے اسی طرح زکوۃ جو معروف ہے وہ ادا کرو اس طرح کہ ان کی شرائط کو پہلے لاؤ جس طرح کہ نماز میں ستر کا ڈھانپا وغیرہ اور ان کی شرائط میں سے یہ ہے کہ ایمان پہلے لایا جائے تو پہلے ایمان لا کر یہ افعال ادا کرو اور جو کفار کی تکلیف بفروع اسلام کو جائز نہیں سمجھتے وہ اس آیت کی وہی تاویل کرتے ہیں جو ابھی مذکور ہوئی اعنی اعتقدوا فرضیۃ الصلوۃ

سوال نمبر ۳۳۱: زکوۃ کا لغوی معنی کیا ہے اور اصطلاحی زکوۃ میں لغوی معنی کی کیا مناسبت ہے نیز نماز کو رکوع سے کیوں تعبیر کیا اور مع الرکعین سے کس بات کی طرف اشارہ ہے؟

جواب: زکوۃ زکا الزرع کے محاورے سے ماخوذ ہے یہ محاورہ تب بولا جاتا ہے جب کھیتی بڑھ جائے اور چونکہ اصطلاحی زکوۃ میں بھی زکوۃ دینے سے مال میں برکت آتی ہے اور نفس کے لیے کرم کی فضیلت حاصل ہوتی ہے اس لیے اسے زکوۃ کہتے ہیں یا یہ زکاء سے بنا ہے جس کا معنی طہارت ہے اب اصطلاحی زکوۃ کی وجہ تسمیہ یہ ہوگی کہ زکوۃ مال کو خبث سے اور نفس کو بخل سے پاک کرتی ہے اس لیے اسے زکوۃ کہتے ہیں نماز کو رکوع سے تعبیر کر کے

یہودیوں کی نماز سے احتراز کیا گیا کیونکہ وہ رکوع ادا نہیں کرتے اور بعض نے کہا رکوع سے مراد خضوع اور اطاعت ہے اس چیز کی جس کو شارع نے لازم فرمایا اور مع الراکعین کی قید سے یہ اشارہ ملتا ہے نماز باجماعت ادا کرو کیونکہ نماز باجماعت 'نمازِ منفرد پر ۲۷ درجے فضیلت رکھتی ہے کیونکہ اس میں لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے اور عیادت وغیرہ کرتے ہیں۔

سوال نمبر ۲۳۲: اتامرون الناس بالبر الخ: ہمزہ کونسا ہے اور بر کسے کہتے ہیں اس کی کون سی تین اقسام ذکر کی گئیں؟

جواب: یہ ہمزہ تقریر مع التوبیخ والتعجیب کے لیے ہے یعنی ان کا لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور اپنے آپ کو بھول جانے کو پکا کیا اس کے ساتھ ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کی گئی اور تعجب کا ظاہر کیا گیا بر خیر میں وسعت پیدا کرنے کو کہتے ہیں اور بَرٌّ سے ماخوذ ہے جو کہ کشادہ فضاء کو کہتے ہیں اور یہ ہر خیر کو شامل ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ بِرٌّ کی تین اقسام ہیں :

(۱) اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بِرٌّ

(۲) اقارب کی رعایت کرنے میں بِرٌّ

(۳) غیروں کے معاملات میں بِرٌّ

سوال نمبر ۲۳۳: وتنسون انفسکم سے افلا تعقلون تک مضمون کی وضاحت کیجئے اور اس میں یہودیوں کی مذمت کی صورت کیا ہے؟

جواب: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت مدینہ منورہ کے یہودی علماء کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ یہ جس کی خیر خواہی چاہتے اسے تنہائی میں نبی اکرم ﷺ کی اتباع کا حکم دیتے لیکن خود نبی اکرم ﷺ کی اتباع نہ کرتے اور بعض نے اس کی تفسیر میں یہ کہا کہ وہ صدقہ کا حکم دیتے تھے اور خود صدقہ نہ کرتے۔ اور وانتم تتلون

الکتاب میں ان کو الزام و اسکات کیا گیا کہ حال یہ ہے کہ تم تورات پڑھتے ہو اور اس میں عناد نیکی کو چھوڑنے اور قول سے عمل کی مخالفت کرنے پر وعید ہے۔

سوال نمبر ۳۴۴: عقل کا لغوی معنی بتائیں اور انسانی عقل کی وجہ تسمیہ ذکر کریں اور بتائیں کہ اس آیت میں فاسق کو وعظ سے منع کیا گیا ہے؟

جواب: عقل کا لغوی معنی الحبس (روکنا) ہے اور ادراک انسانی کو عقل اس لیے کہتے ہیں کہ وہ انسان کو قبیح افعال و اقوال سے روکتی ہے اور اچھے کام کرنے پر کاربند رکھتی ہے پھر عقل اس قوت کو کہا جانے لگا جس سے نفس اس ادراک کو پاتا ہے اس آیت میں واعظ کو اپنے تزکیۂ نفس اور اس کی تکمیل کرنے پر ابھارا گیا ہے تاکہ وہ خود قائم ہو اور دوسرے کو بھی قائم کرے فاسق کو وعظ سے منع نہیں کیا گیا کیونکہ وہ مامور بہ دو امروں (وعظ اور تزکیہ نفس) میں سے ایک میں خلل دوسرے میں خلل کو ثابت نہیں کرتا۔

سوال نمبر ۳۴۵: صبر اور نماز کے ذریعے مدد مانگنے کی کیا صورت ہے نیز نماز تمام عبادات کی جامع ہے اس کی وضاحت کیجئے کیا صلوۃ سے یہاں کوئی اور بھی معنی مراد لیا گیا ہے اگر لیا گیا ہے تو وہ کیا ہے؟

جواب: صبر اور نماز کے ذریعے مدد مانگنے سے مراد یہ ہے کہ اپنی ضروریات پر کامیابی اور کشادگی کے انتظار کے ذریعے مدد طلب کرو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے یا اس روزے کے ذریعے مدد طلب کرو (اپنی ضروریات پر) جو کہ مفطرات (کھانے کی حلال چیزوں) سے صبر کرنا ہے کیونکہ اس میں شہوت ٹوٹ جاتی ہے اور نفس صاف ہو جاتا ہے اور نماز کے ذریعے مدد مانگنے سے مراد یہ ہے کہ نماز کا وسیلہ پیش کرو اور نماز کی طرف مائل رہو۔

نماز تمام عبادات کی جامع ہے چاہے وہ نفسانیہ (نفس سے متعلق) ہوں یا بدن سے متعلق جس طرح کہ طہارت، ستر عورت اور ان دونوں پر مال خرچ کرنا، کعبہ کی طرف

متوجہ ہونا اور عبادت کے لیے ٹھہر جانا عکوف کرنا اعضاء سے خشوع کا اظہار کرنا اور دل نے نیت کو خالص کرنا' شیطان سے جہاد کرنا حق تعالیٰ سے مناجات کرنا' قرآنِ کریم کی قراءت کرنا اور شہادتین کو ادا کرنا نفس کو الطیبین (دو عمدہ و پاکیزہ چیزوں یعنی کھانے اور جماع) سے روکنا تو یہ تمام عبادات فقط ایک عبادت' نماز میں پائی جاتی ہیں۔ نماز سے دعا کا معنی بھی مراد لیا گیا ہے۔

سوال نمبر ۳۳۶: وانها لکبیرة الخ میں ہاء ضمیر کا مرجع کیا ہے کبیرہ سے کیا مراد ہے اور خاشعین کی استثناء کی وجہ کیا ہے؟

جواب: انها میں ہائے ضمیر کا مرجع یا صبر اور الصلوة دونوں ہیں من حیث المفرد یا اس کا مرجع الصلوة ہے اور ضمیر صرف اس کی طرف اس لیے لوٹائی گئی کہ ایک تو اس کی شان عظیم ہے اور دوسرا یہ کہ نماز' صبر کی تمام اقسام کو شامل ہے یا اسکا مرجع وہ تمام اشیاء ہیں جن کا پہلے حکم دیا گیا اور جن سے روکا گیا۔ کبیرة سے مراد ثقیلة (بھاری) اور شاقة (مشقت والی) ہے خاشعین کی استثناء کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نفوس ان کاموں کے بدلے میں ملنے والے اجر کی وجہ سے ان پر راضی ہیں اس لیے اس میں وہ مشقت محسوس نہیں کرتے اور اس وجہ سے وہ تھکا دینے والی عبادتوں میں بھی لذت محسوس کرتے ہیں اسی وجہ سے سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا جعلت قرة عینی فی الصلوة (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے)

سوال نمبر ۳۳۷: خاشعین کا وہ وصف جو قرآن مجید نے بیان کیا اس کی وضاحت کریں اور بتائیں کہ قرآنِ مجید نے لفظِ ظن ذکر کیا حالانکہ یہ مقام یقینی ہے؟

جواب: خاشعین خشوع سے بنا ہے جس کا معنی الاخبات (سر جھکانا) ہے اور پست زمین کو بھی خشعة کہتے ہیں خشوع کا تعلق جوارح (اعضاء) سے ہے کیونکہ جھکنا اعضاء کی

صفت ہے اور خضوع کا دل سے تعلق ہے کیونکہ خضوع بات ماننے اور نرمی کو کہتے ہیں یہاں ظن یقین کے معنی میں ہے اس کی تائید مصحف ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوتی ہے کہ اس میں یظنون کی جگہ یعلمون ہے اور علم یقین کے لیے آتا ہے۔ اسی طرح اوس بن حجر شاعر نے کہا فار سلته مستيقن الظن انه تو یہاں بھی ظن پر یقین کا اطلاق کیا۔

سوال نمبر ۳۳۸: دوبارہ بنی اسرائیل کو نعمتیں یاد دلانے میں کیا حکمت ہے نیز بنی اسرائیل کی العالمین پر فضیلت سے کیا مراد ہے اور کیا اس سے انسان کا فرشتوں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا؟

جواب: اس میں ایک تو تاکید ہے اور دوسرا یہ کہ ان کو تفضیل (فضیلت دینے) کی نعمت یاد دلائی گئی جو کہ نعمتوں سے اجل ہے بنی اسرائیل کی العالمین پر فضیلت سے مراد ان کے زمانہ کے عالمین ہیں اور اس سے مراد ان کے آباؤ اجداد کی تفضیل ہے جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے انہوں اللہ تعالیٰ کی عطاء (ایمان اور عمل صالح) کو بدل دیا حتی کہ اور اللہ عزوجل نے ان میں سے انبیاء اور بادشاہ بنائے بعض نے یہ کہا کہ عالمین میں چونکہ فرشتے بھی ہیں اس لیے بشر کی تفضیل فرشتوں پر ثابت ہوتی ہے لیکن مصنف فرماتے ہیں کہ یہ استدلال ضعیف ہے (ہمارے مذہب میں انبیاء علیہم السلام کو جملہ ملائکہ پر فضیلت ہے اور خاص ملائکہ عام مؤمنین سے اور عام مؤمنین عام فرشتوں سے افضل ہیں)

سوال نمبر ۳۳۹: لا تجزی الخ کا نحوی مقام بیان کریں اور اس لفظ کا مادہ اشتقاق ذکر کریں؟

جواب: لا تجزی الخ یَوْمًا کی صفت ہے اس آیت میں شیئا مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی بناء پر منصوب ہے لا تجزی کا مادۂ اشتقاق جزاء ہے اس جملے میں عائد محذوف ہے تقدیر عبارت لا تجزی فيه ہے اور جو عائد مجرور کو محذوف کرنا جائز نہیں سمجھتے ان کے

نزدیک اس میں وسعت پیدا کی گئی پھر فــــی جار کو حذف کر دیا گیا اور ضمیر کو مفعول بہ کے قائم مقام کر دیا گیا۔

سوال نمبر ۲۴۰: دفع عذاب کے لیے کتنی اور کون کونسی صورتوں کا احتمال ہوتا ہے حصر کے انداز میں ذکر کر کے اس آیت کے ساتھ ان کی موافقت بتائیں؟

جواب: دفع عذاب کی چار صورتیں ہیں کہ: دفع عذاب یا تو قہر (غلبہ) کے ساتھ ہوگا یا قہر کے علاوہ کے ساتھ پہلی صورت میں مدد کہلائے گی دوسری صورت میں پھر دو حال سے خالی نہیں کہ وہ مفت ہوگی یا نہیں پہلی صورت میں وہ شفاعت وسفارش ہوگی اور دوسری صورت پھر دو حال سے خالی نہیں کہ جو اس پر لازم تھا وہ اس کو ادا کر دے گا یا نہیں پہلی صورت میں جز اور دوسری صورت میں عدل (فدیہ) ہے اور ان میں کوئی صورت نہ ہوگی کہ وہ کسی کی طرف سے بدلہ بنے نہ اس سے شفاعت قبول کی جائے گی نہ اس سے معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

سوال نمبر ۲۴۱: شفاعت کی وجہ تسمیہ کیا ہے اور کیا اس آیت سے شفاعت کی نفی نہیں ہو رہی نیز نفس کی طرف جمع مذکر کی ضمیر کیسے راجع ہوئی؟

جواب: شفاعت شفع سے بنا ہے جس کا معنی ملانا ہے اب شفاعت کی وجہ تسمیہ یہ ہوگی کہ مشفوع لہ پہلے اکیلا تھا شفیع نے اسے اپنے ساتھ ملا کر جوڑا بنا دیا یہ آیت کفار کے ساتھ خاص ہے کیونکہ یہ خطاب کفار سے ہے رہی بات مسلمانوں کی شفاعت کی تو اس کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ کثیر آیات واحادیث شفاعت کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں۔ نفس نکرہ ہے اور چونکہ یہ سیاق نفی کے تحت داخل ہے اس لیے عموم کا مقتضی ہے اور نفوس کثیرہ کو شامل ہوگا اور اس لیے جمع کی ضمیر ھــم راجع کی گئی اور مذکر اس لیے لائی گئی کہ نفس عباد یا اناس کے معنی میں ہے اور یہ مذکر ہیں لہذا ضمیر بھی مذکر کی راجع کی گئی۔

سوال نمبر۳۴۲: واذ نجینا کم الخ : میں مختلف قراءتوں کی وضاحت کریں ماقبل سے تعلق بتائیں نیز آل اور اھل کا فرق واضح کرتے ہوئے یہ بھی بتائیں کہ فرعون کا لغوی معنی کیا ہے اور یہ کس ملک کے بادشاہوں کا لقب تھا اور اس فرعون کا کیا نام تھا؟

جواب: یہ ماقبل کے اجمال کی تفصیل ہے اور نعمتی پر اسکا عطف، عطف الخاص علی العام کے قبیلے سے ہے ایک قراءت میں انجیتکم اور دوسری میں نجیتکم پڑھا گیا ہے۔ آل کا استعمال ان حضرات کے ساتھ خاص ہے جن کا مرتبہ بلند ہو چاہے دنیوی اعتبار سے جیسے آل فرعون یا اخروی اعتبار سے جیسے آل ابراہیم علیہ السلام۔ فرعون تفرعن الرجل سے بنا ہے اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی سرکش اور ظلم کرنے والا بن جائے اس فرعون کا نام مصعب بن ریان تھا بعض نے کہا کہ وہ فرعون اس کا بیٹا ولید تھا (یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل فرعون تھا) اور حضرت یوسف علیہ السلام کے مقابلے میں ریان فرعون تھا۔

سوال نمبر۳۴۳: سوء العذاب لفظ سوء کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق ذکر کریں منصوب ہونے کی وجہ بیان کریں اور بتائیں کہ یہ جملہ حال ہے تو ذوالحال کیا ہے؟

جواب: سوء، ساء یسوء کا مصدر ہے اور یہ یسومونکم کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور سوء کا اصطلاحی معنی (شدید برا ہے جو شدت و برائی کی حدوں کو تجاوز کر جائے) اور یہ جملہ نجینا کم کی کم ضمیر سے حال ہے یا آل فرعون سے حال ہے یا دونوں سے کیونکہ اس میں ضمیر دونوں کی طرف علی الافراد راجع ہوتی ہے۔

سوال نمبر۳۴۴: یذبحون ابناء کم الخ پچھلے جملے کے ساتھ تعلق بیان کریں اور بنی اسرائیل کے بیٹوں کو فرعون کیوں ذبح کرتے تھے وجہ بیان کریں؟

جواب: یہ یسومونکم کا بیان ہے اس وجہ سے اس کا عطف اس پر نہیں کیا گیا فرعونی ابناء

بنی اسرائیل کو اس لیے ذبح کرتے تھے کہ فرعون نے خواب میں دیکھا یا کاہنوں نے اسے کہا
کہ بنی اسرائیل میں سے ایک بچہ پیدا ہوگا اور وہ فرعون کی حکومت ختم کردے گا۔ (فلم یرد
اجتهادهم من قدر الله تعالیٰ شیئا) لیکن انکی کوشش اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو بدل نہ
سکی۔

سوال نمبر ۳۴۵: بلاء من ربکم الخ بلاء کے دو معنی کون کونسے ہیں یہاں کونسا معنی مراد
ہے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں کی گئی اور اس کی عظمت کس وجہ سے ہے؟
جواب: اگر ذلکم سے اشارہ ان کے فعل کی طرف ہو تو بلاء سے مراد محنت ہوگی اور اگر اس
سے اشارہ انجاء کی طرف ہو تو اس سے مراد نعمت ہوگی۔ اور یہاں یہ دونوں معانی مراد
ہو سکتے ہیں اور بلاء کا لغوی معنی اختبار (آزمائش) ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی
محنت کے ساتھ اور کبھی عطاء کے ساتھ آزماتا ہے اس لیے ان دونوں پر بلاء کے لفظ کا
اطلاق کردیا گیا۔ نیز آیت میں ممکن ہے کہ ذلکم میں اشارہ دونوں (انجاء و فعل) کی
طرف ہو اس صورت میں بلاء سے امتحان مراد ہوگا جو کہ عطاء و محنت کو شامل ہے۔ بلاء کی
صفت عظیم کے ساتھ لائی گئی کہ یہ عطیہ بہت عظمت والا تھا کہ اس سے ان کو نجات مل گئی۔
سوال نمبر ۳۴۶: دریا کے پھٹ جانے اور بنی اسرائیل کی نجات پر آل فرعون کے غرق
ہونے کا واقع ذکر کریں اور یہ بھی بتائیں کہ دریا کے پھٹنے کی صورت کیا تھی اور وانتم
تنظرون میں کس بات کی اشارہ ہے؟
جواب: چونکہ آل فرعون بنی اسرائیل پر ظلم کرتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ
علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو لے کر نکل جائیں چنانچہ فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا
پیچھا کیا اور ان کو دریا کے کنارے پر پایا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی
بھیجی کہ اپنا عصا مبارک پانی پر ماریں چنانچہ اس سے دریا میں بارہ خشک راستے پید ہو گئے

اور وہ اس پر چلنے لگے انہوں نے کہا ہمیں ڈر ہے کہ ہم میں سے بعض ہلاک ہو جائیں اور
ہمیں پتہ بھی نہ چلے تو اللہ تعالیٰ نے ان راستوں کے درمیان پانی کی کھڑی دیواروں میں
کھڑکیاں بنا دیں تاکہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اس طرح وہ دوسرے کنارے پر پہنچ
آ گئے۔

جب فرعون اور اس کے ساتھی وہاں پہنچے اور انہوں نے دریا میں راستہ دیکھا تو
اس میں داخل ہو گئے لیکن پانی نے ان کو آ لیا اور وہ ڈوب گئے۔

یہ واقعہ ایک طرف بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت تھا تو دوسری طرف
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق بھی تھی۔

وانتم تنظرون میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم فرعونیوں کو غرق ہوتا یا
ان پر راستوں کو بند ہوتا دیکھ رہے تھے یا تمام واقعہ کی طرف اشارہ ہے یا یہ کہ جب سمندر
نے ان کے جسموں کو کنارے پر پھینکا تو تم اسے دیکھ رہے تھے۔

سوال نمبر ۲۴۷: امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس واقعہ کو بنی اسرائیل پر سب سے بڑی نعمت
قرار دیا اس کی وجہ بتائیں۔ اور اس واقع کے بعد بچھڑے کی پوجا کرنے کے پیش نظر امام
بیضاوی رحمہ اللہ نے نبی اکرم ﷺ کی امت کو ان سے بہتر قرار دیا اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: یہ واقعہ اس اعتبار سے بنی اسرائیل پر بڑی نعمت قرار دیا گیا کہ اس میں ایسی نشانیاں
تھیں جن سے حکمت والے صانع کے وجود کا علم حاصل ہوتا ہے نیز اس میں حضرت موسیٰ
علیہ السلام کی تصدیق بھی تھی حضرت امام بیضاوی فرماتے ہیں ان لوگوں نے جو دیکھا وہ
محسوسات میں سے ہے اور نبی اکرم ﷺ کے معجزات نظریہ ہیں جن کو ذہین اور عقلمند لوگ ہی
سمجھ سکتے تھے لیکن اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی امت نے آپ کی اتباع کی لیکن بنی
اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو ظاہری طور پر

نہ دیکھیں ایمان نہیں لائیں گے تو اس سے معلوم ہوا کہ امت محمد یہ ﷺ ان سے بہتر امت ہے۔

سوال نمبر ۳۴۸: واذ واعدنا الخ ایک قراءت وعدنا ہے دونوں میں کیا فرق ہے نیز یہ واقعہ کونسے مہینوں میں ہوا اور ان کو راتوں سے کیوں تعبیر کیا؟

جواب: یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب وہ لوگ مصر کی طرف لوٹے اور فرعون ہلاک ہو چکا تھا ابن کثیر، نافع، عاصم، ابن عامر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے واعدنا پڑھا لیکن دونوں طرف سے وعدہ تھا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وحی کا وعدہ فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر حاضر ہونے کا وعدہ کیا یہ وعدہ ذی قعدہ کا مکمل مہینہ اور ذوالحج کے دس دن تھے اور اسے چالیس راتوں سے تعبیر کیا کیونکہ مہینوں کا آغاز راتوں سے ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۳۴۹: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب، اور فرقان عطا کی گئی دونوں میں فرق کے بارے میں اقوال بیان کیجئے؟

جواب: یہاں پانچ قول ہیں

(۱) ایک قول یہ ہے کہ تورات کو بھی کتاب کہا گیا اور اسے ہی فرقان فرمایا کیونکہ وہ حجت تھی جو حق و باطل میں فرق کرتی تھی۔

(۲) دوسرے قول کے مطابق کتاب سے تورات اور فرقان سے معجزات مراد ہیں کیونکہ ان سے اہل حق اور جھوٹے لوگوں میں فرق ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے کفر و ایمان میں امتیاز ہوتا ہے جو مانتا ہے وہ مومن اور جو نہیں مانتا وہ کافر ہوتا ہے۔

(۴) چوتھا قول یہ ہے کہ فرقان سے شریعت مراد ہے جو حلال و حرام میں فرق کرتی ہے۔

(۵) پانچویں قول کے مطابق فرقان سے مدد مراد ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے دشمنوں میں تفریق کردی جس طرح یوم بدر کو یوم الفرقان کہا گیا۔

سوال نمبر ۳۵۰: ''بارئ'' پیدا کرنے والے کو کیا کہتے ہیں اس کی لغوی اصطلاحی تحقیق پیش کریں؟

جواب: برئ کا معنی کسی چیز کا دوسری چیز سے الگ ہونا ہے جس طرح'' برئ المریض من مرضه'' یا'' برئ المدیون من دینه '' یا یہ علیحدگی اشیاء کے طور پر بھی ہوتی ہے۔ جیسے '' برأ الله ادم من الطین'' اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو یوں پیدا کیا کہ اس میں تفاوت نہیں البتہ صورتوں میں ایک دوسرے سے ممتاز رکھا اس لیے اسے باریٔ کہا جاتا ہے اور یہ لفظ' لفظ خالق سے اخص ہے۔

سوال نمبر ۳۵۱: بنی اسرائیل کو توبہ کے طور پر قتل کا حکم دیا اس سے کیا مراد ہے تفصیل سے بیان کریں؟

جواب: (۱) خواہشات کو مارنا مراد ہے جیسا کہ کہا گیا '' من لم یعذب نفسه لم ینعمها ومن لم یقتلها لم یحیها'' جو شخص اپنے آپ کو مشقت میں نہیں ڈالتا اسے عیش حاصل نہیں ہوتا اور جو آدمی اپنے نفس کو قتل نہیں کرتا وہ اسے زندہ نہیں رکھتا تو یہاں قتل سے خواہشات کا قلع قمع کرنا مراد ہے۔

(۲) ایک قول یہ ہیکہ ان کو یہ حکم دیا گیا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں (اس شریعت میں بطور توبہ یہ عمل جائز رکھا گیا)

(۳) جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی تھی ان کو حکم ہوا کہ وہ پوجا کرنے والوں کو قتل کریں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال نمبر ۳۵۲: اس قتل کا ان کے لیے بہتر ہونا کس بنیاد پر ہے نیز توبہ کی قبولیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ''فتاب علیکم'' حالانکہ توبہ کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ اور یہ بھی بتائیے کہ اس ترکیب کلام میں کس بات کی طرف اشارہ ہے؟

جواب: اس عمل کی بہتری اس اعتبار سے ہے کہ یہ شرک سے پاکیزگی اور ابدی زندگی کا ذریعہ ہے ''فتاب علیکم'' یا تو محذوف سے متعلق ہے اگر اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام قرار دیا جائے تو تقدیر عبارت یوں ہوگی '' ان فعلتم ما امرتم فتاب علیکم '' اگر تم وہ کام کرو جس کا تمہیں حکم دیا گیا تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول کرے گا۔

اور اگر اللہ کی طرف سے خطاب ہو تو محذوف پر عطف ہوگا گویا فرمایا '' ففعلتم ما امرتم به فتاب علیکم بارئکم '' پس تم نے مامور بہ پر عمل کیا تو تمہارے پیدا کرنے والے نے تمہاری توبہ قبول کی۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ انتہائی جہالت کو پہنچ گئے تھے حتیٰ کہ اپنے خالق کی عبادت چھوڑ دی جو حکمت والی ذات ہے اور اس کے غیر کی پوجا شروع کر دی اور جو شخص اپنے منعم کے حق کو نہ پہچانے وہ اس بات کے لائق ہے کہ اس سے زندگی واپس لی جائے اس لیے ان کو قتل کا حکم دیا۔

سوال نمبر ۳۵۳: لفظ جہر کے حوالے سے مفسر علیہ الرحمہ کی تحقیق ذکر کریں اور کن لوگوں نے کہا تھا کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو جہرتاً نہ دیکھ لیں اور جس بات پر ایمان لانا تھا وہ کیا ہے؟

جواب: جہرۃ کا معنی واضح طور پر دیکھنا ہے لفظ جہرۃ مصدر ہے کہا جاتا ہے '' جہرت بالقرأۃ'' میں نے بلند آواز سے قراءت کی یعنی واضح اور ظاہر۔ بطور مجاز دیکھنے کے معنی میں مستعمل ہے اس کا نصب مصدر (مفعول مطلق) یا حال ہونے کی وجہ سے ہے حال فاعل

سے ہوگا یا مفعول سے، جہرۃ ہاء پر فتح کے ساتھ جاھر کی جمع کے طور پر پڑھا گیا اس صورت میں یہ حال ہوگا۔ اس بات کے قائل وہ ستر افراد تھے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر جانے کے لیے منتخب کیا یہ بھی کہا گیا کہ آپ کی قوم کے دس ہزار افراد تھے۔

جس چیز پر ایمان سے انہوں نے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے سے مشروط کیا وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے آپ کو تورات دی اور آپ سے کلام کیا یا آپ کی نبوت پر ایمان لانا مراد ہے۔

سوال نمبر ۳۵۴: بنی اسرائیل کو کڑک نے آ لیا اس کی وجہ ان کا ایک مطالبہ تھا جو محال ہے وہ کیا مطالبہ تھا اور کیا دیدار خداوندی ممکن ہے نیز صاعقۃ کے حوالے سے دوسرے احتمال ہوں تو وہ بھی بتائیں؟

جواب: ان لوگوں کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح دیکھیں جس طرح جسموں کو کسی جہت میں دیکھا جاتا ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کو جسموں کے مشابہ قرار دیا لیکن یہ بات محال ہے۔

ہاں اللہ تعالیٰ کو کسی کیفیت کے بغیر دیکھنا ممکن ہے جو مومنوں کو آخرت میں حاصل ہوگا اور انبیاء کرام میں سے بعض کو دنیا میں بعض حالتوں میں یہ شرف حاصل ہوا۔

صاعقۃ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ آسمان سے آگ آئی اور اس نے ان کو جلا دیا یہ بھی کہا گیا کہ ایک چیخ تھی کسی نے کہا وہ ایک لشکر تھا جن کی آہٹ سن کر وہ بیہوش ہو گئے اور ایک دن رات بیہوش رہے۔

سوال نمبر ۳۵۵: ثم بعثنکم من بعد موتکم الخ: موت کی قید کیوں ہے اور لعلکم تشکرون میں کس بات کی طرف اشارہ ہے؟

جواب: مطلب یہ ہے کہ جب بعثت موت کے بعد ہوتی ہے تو موت کی قید کیوں ہے تو اس

میں یہ بتایا گیا کہ جس طرح موت کے بعد اٹھنا ہے اسی طرح نیند اور بیہوش ہونے کے بعد بھی بعثت ہوتی ہے اگر موت کی قید نہ ہوتی تو پتہ نہ چلتا کہ وہ مر گئے تھے یا بیہوش ہوئے تھے یا سو گئے تھے۔

لعلکم تشکرون میں موت کے بعد اٹھنے کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایک نعمت ہے یا جس نعمت کا تم نے انکار کیا اس نعمت پر تشکر کرو۔

سوال نمبر ۲۵۶: وظللنا الخ کا پس منظر بتائیں نیز من اور سلویٰ کیا ہے اور ما ظلمونا میں کس ظلم کی طرف اشارہ ہے؟

جواب: جب بنی اسرائیل نے قوم عمالقہ سے مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا تو وہ چالیس سال میدان تیہ میں بھٹکتے رہے وہاں کوئی رہائش گاہ نہ تھی تو ان پر بادلوں کا سایہ کیا گیا رات کو روشنی کے لیے ایک نورانی ستون اترتا کھانے کے لیے مَنّ اور سلویٰ اتارا گیا مَنّ ترنجبین کو کہتے ہیں یہ جمے ہوئے شہد کی طرح تھا جو ان کے درختوں پر اترتا تھا اترنے کا یہ عمل طلوعِ فجر سے طلوع آفتاب تک ہوتا یہ برف کی طرح اترتا اور ہر آدمی اس قدر لیتا جو ایک دن رات کے لیے کافی ہوتا اگر زیادہ لیتا تو اس میں کیڑے پڑ جاتے چونکہ ہفتے کے دن نہیں اترتا تھا اس لیے جمعہ کے دن دو دنوں اور دو راتوں کے لیتے تھے اور سلویٰ بھنا ہوا پرندہ تھا اسی طرح ان کے کپڑے نہ میلے ہوتے اور نہ پرانے پھر ان لوگوں نے ناشکری کی تو یہ ان کا اپنے اوپر ظلم کرنا تھا۔

سوال نمبر ۲۵۷: حطة کے حوالے سے مصنف کی تقریر ذکر کریں اور خطایاکم میں لفظ خطایا کی تحقیق پیش کریں؟

جواب: لفظ حطة ' حط سے فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے حطة گناہوں کو مٹانا حطة مبتدا محذوف کی خبر ہے اس لیے مرفوع ہے یعنی'' مسالتنا حطة'' ہمارے سوال گناہوں کی

معانی ہیں یا قولوا کا مفعول ہے یعنی "قولوا حطة (تم لفظ حطة کہو) ایک قول کے مطابق اس کا معنی " امرنا حطة" ہے یعنی ہم اس بستی میں اتریں اور قیام کریں۔

خطایا اصل میں خطایئی ہے جس طرح خصائع سیبویہ کے نزدیک یا زائدہ کو ہمزہ سے بدل دیا کیونکہ وہ الف کے بعد واقع ہوتی اب دو ہمزے جمع ہوئے دوسرے ہمزہ کو یاء سے بدل دیا پھر اسے الف سے بدلا اب ہمزہ دو الفوں کے درمیان تھا لہذا اسے یاء سے بدلا تو خطایا ہو گیا خلیل نحوی کے نزدیک ہمزہ کو یاء پر مقدم کیا گیا پھر مذکورہ بالا عمل ہوا۔

سوال نمبر ۳۵۸: سنزید المحسنین کو جواب کی صورت میں نہ لانے کی کیا وجہ ہے اور محسنین سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: وسنزید المحسنین کا عطف نغفرلکم پر ہے اور معنی یہ ہے کہ تم میرا حکم مانوا ہم تم میں سے گناہ گاروں کے گناہ معاف کردیں گے اور نیکوکاروں کو مزید ثواب عطا کریں گے لیکن سنزید کو جواب امر سے نکال دیا اس لیے یہ مجزوم نہیں ہے حالانکہ نغفرلکم جواب امر ہے اور اس پر عطف کی وجہ سے مجزوم ہونا چاہیے تو اسے جواب امر سے نکال کر وعدہ کی شکل دی اور اس پر سین داخل کردی جو جزم سے مانع ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالٰی محسنین سے اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور یہ بتایا کہ محسنین زیادہ ثواب کے درپے ہیں اگرچہ عمل نہ کریں اور اگر عمل کریں تو کیا حال ہوگا۔

اور محسنین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ تعالٰی کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں اور اسکے حکم کے سامنے خوب جھکتے ہیں۔

سوال نمبر ۳۵۹: بنی اسرائیل نے اللہ تعالٰی کے حکم قولوا حطة میں کیا تبدیلی کی اور ان کو کیا سزا ملی؟

جواب: انہوں نے استغفار کی بجائے دنیا کا مال طلب کیا جس طرح ایک قول کے مطابق حطة کی بجائے حنطة (گندم) کہا اس کی سزا کے طور پر ان پر عذاب نازل ہوا کہا گیا ہے کہ یہ طاعون تھا ایک قول یہ ہے کہ ایک ساعت میں اس سے چوبیس ہزار لوگ گر گئے تھے یہاں تک کہ ستر ہزار ہلاک ہو گئے۔

سوال نمبر ۳۹۰: رجز سے کیا مراد ہے نیز رجز اور رجس میں کیا فرق ہے؟

جواب: رجز اسے کہتے ہیں جس سے نفرت اور کراہت ہو اور رجس بھی یہی ہے۔

سوال نمبر ۳۶۱: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا مبارک کہاں سے آیا اور جس پتھر پر اسے مارا گیا کہاں سے لایا گیا نیز یہ پتھر اور عصا کتنے کتنے گز کے تھے؟

جواب: یہ ایک چوکور پتھر تھا جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور سے لائے تھے اس کی ہر طرف سے تین چشمے جاری ہوئے یوں کل بارہ چشمے ہو گئے اور وہاں سے ہر قبیلے کی طرف نہریں جاری ہوئیں ان لوگوں کی تعداد سات لاکھ سے زیادہ تھی جو بارہ میلوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

یا یہ پتھر حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے آیا اور حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا یا یہ پتھر وہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کے بھاگا تھا جب آپ نے غسل کے لیے اپنے کپڑے اتار کر اس پر رکھے تھے حضرت جبریل علیہ السلام کے کہنے پر آپ نے اس کو ساتھ لے لیا یا محض کوئی پتھر تھا یہ زیادہ ظاہر ہے ایک قول کے مطابق سنگ مرمر کا پتھر تھا جو چاروں طرف ایک ایک ہاتھ تھا عصا حضرت شعیب علیہ السلام نے آپ کو دیا تھا یہ جنت سے آیا تھا اور اس کی دو شاخیں تھیں جو اندھیرے میں روشن ہوتی تھیں یہ دس ہاتھ یعنی چھ گز سے زائد تھا۔

سوال نمبر ۳۶۲: واذ قلنا ادخلوا هذه القرية الخ اس سے کونسی بستی مراد ہے سجدا

میں کسی قسم کے سجدے کا حکم ہے اور اس سجدے کا سبب کیا تھا؟

جواب: اس بستی سے بیت المقدس مراد ہے بعض نے کہا اریحا نامی بستی مراد ہے سجدے سے یا تو جھکنا مراد ہے یا واقعی سجدہ مراد ہوگا اور اس کا سبب میدان تیہ سے نکلنے پر اللہ تعالیٰ کے لیے شکر ادا کرنا تھا۔

سوال نمبر۳۶۳ :فانفجرت الخ فاء جزائیہ ہے جب کہ اس سے پہلے شرط نہیں اس کا کیا جواب ہے نیز عشرۃ کی لغات ذکر کریں؟

جواب: فانفجرت محذوف سے متعلق ہے تقدیر عبارت یہ ہے "فان ضربت فقد انفجرت"۔ یا "فضرب فانفجرت" اس طرح فاء جزائیہ اور اس سے پہلے شرط محذوف ہے "عشرۃ" میں شین مکسور اور مفتوح دونوں طرح پڑھی جاتی ہے (یہ دو لغت ہیں)

سوال نمبر۳۶۴ :کلوا واشربوا الخ میں رزق سے کیا مراد ہے نیز جب ولا تعثوا میں فساد سمجھا جاتا ہے تو مفسدین کی قید کیوں لائی گئی تعثوا اور بعثت میں باب اور معنی کے اعتبار سے فرق واضح کریں؟

جواب: اس رزق سے مراد من اور سلویٰ اور چشموں کا پانی ہے بعض نے کہا اس سے صرف پانی مراد ہے جو پیا جاتا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی سبزی وغیرہ کھائی جاتی ہے۔ لا تعثوا کا معنی ہے فساد کرتے ہوئے حد سے نہ بڑھو لیکن بعض اوقات یہ عثی فساد نہیں ہوتا جس طرح حد سے بڑھنے والے ظالم کا مقابلہ کرنا اس لیے مفسدین فرما کر فساد کی قید لگائی گئی۔ العبث باب "علم یعلم" سے ہے اور عثو یعثو باب "نصر ینصر" سے ہے اور دونوں کا معنی تقریباً ایک ہے لیکن عام طور پر العبث کا استعمال اس چیز میں ہوتا ہے جس کا ادراک بطور حس ہو۔

سوال نمبر ۳۶۵: ان معجزات کے منکر کو مفسر نے انتہائی جاہل قرار دیا اس کی کیا وجہ بیان کی ہے؟

جواب: مصنف علیہ الرحمہ نے ان منکرین کو اس لیے بہت بڑا جاہل قرار دیا کہ جب پتھروں سے بال مونڈے جاسکتے ہیں، پتھر کو سر کے میں ڈالا جائے تو وہ باہر آ جاتا ہے مقناطیسی پتھر لوہے کو کھینچ سکتا ہے تو پتھر زمین کے نیچے سے پانی کیوں باہر نہیں لاسکتا۔ یا ہوا کو کھینچ کر اس کو پانی میں بدل دے جب کہ مندرجہ بالا امور ممکن ہیں تو پھر پتھر سے پانی کا نکلنا کیوں ناممکن ہے لہذا ان لوگوں کا اس بات پر غور نہ کرنا ان کی بہت بڑی جہالت ہے۔

سوال نمبر ۳۶۶: بنی اسرائیل نے کہا ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے جب کھانا ایک نہیں تھا (بلکہ من اور سلویٰ دو کھانے تھے) تو ایک کھانا کیسے کہا گیا دلائل کے ساتھ ذکر کریں؟

جواب: چونکہ اس کھانے میں تبدیلی نہیں ہوتی تھی اس لیے اسکو ایک قرار دیا جیسے کہا جاتا ہے طعام مائدہ الامیر واحد مطلب یہ ہے کہ اس کا رنگ نہیں بدلتا اسی عدم تبدیلی کی وجہ سے وہ تنگ پڑ گئے یا ایک نوع مراد ہے اور وہ کاشتکار تھے اس کے کھانے سے اکتا گئے یعنی روزانہ ایک ہی قسم کا کھانا مراد ہے اگر چہ وہ دو قسم کا کھانا تھا۔

سوال نمبر ۳۶۷: یخرج لنا میں جزم کیوں ہے؟ اور انبات کی نسبت اللہ تعالیٰ کی بجائے زمین کی طرف کی گئی ہے یہ کونسی نسبت ہے؟

جواب: فادع (امر) کا جواب ہونے کی وجہ سے یخرج مجزوم ہے اور انبات کی نسبت زمین کی طرف نسبت مجازی ہے اور قابل (زمین) کو فاعل (اللہ تعالیٰ) کے قائم مقام کیا گیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اگانے کے اثر کو زمین قبول کرتی ہے۔

سوال نمبر ۳۶۸: من بقلها: ترکیب میں کیا واقع ہو رہا ہے نیز ادنی کھانے سے کیا مراد ہے نیز دنو اور رفعت کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ ذکر کر کے مثالیں بھی دیں؟

جواب: من بقلها: حال کی جگہ پر ہے بعض نے کہا کہ حرف جر کے اعادہ سے یہ بدل ہے ادنی سے مراد یا تو مقام کے اعتبار سے زیادہ قریب ہے یا مرتبہ کے اعتبار سے زیادہ گھٹیا ہوتا ہے دنو اصل میں مکان میں قرب کے لیے آتا ہے پھر بطور مجاز خسیس کے لیے استعمال ہونے لگا جس طرح لفظ بُعْد شرف کے لیے بطور مجاز استعمال ہوتا ہے رفعت بلندی کو کہتے ہیں اور اس سے مراد محل اور ہمتوں سے دور ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۳۶۹: اھبطوا مصرا الخ میں ھبوط کا ذکر ہے جو بلندی سے اترنے کا معنی دیتا ہے کیا یہ معنی یہاں صحیح ہے اور مصر عام شہر ہے یا خاص؟ اگر خاص ہے تو تنوین کیوں آئی جب کہ یہ علم ہے؟

جواب: ھبوط اترنے اور نکلنے کے معنی میں آتا ہے ھبط الوادی (وادی میں اترا) ھبط منه جب مِن کے ساتھ ہو تو" خرج منه" کے معنی میں آتا ہے یہاں میدان تیہ سے نکل کر شہر میں جانا مراد ہے مصر بہت بڑے شہر کو کہتے ہیں اور اصل میں دو چیزوں کے درمیان حد کو کہا جاتا ہے بعض نے کہا یہاں خاص شہر کا نام مراد ہے اور اس پر تنوین لا کر منصرف پڑھا گیا کیونکہ اس کا درمیان والا حرف ساکن ہے اس لیے غیر منصرف نہیں ہوسکتا یا یہ بلد کی تاویل میں ہوگا اب منع صرف کا صرف ایک سبب یعنی علم ہوگا اس لیے منصرف پڑھیں گے ایک قول یہ ہے کہ اس سے خاص شہر مراد نہیں بلکہ کوئی بھی بڑا شہر مراد ہے۔

سوال نمبر ۳۷۰: بنی اسرائیل پر ذلت و مسکنت مسلط ہونے کا کیا مطلب ہے حالانکہ آج یہودی پوری دنیا پر چھائے ہوئے ہیں؟

جواب: قرآن مجید میں " ضربت علیهم الذلة و المسكنة" فرمایا گیا تو اس سے مراد ان کا ذلت میں گھر جانا یا ذلت کا ان سے چمٹ جانا مراد ہے جیسے ضرب الطین علی الحائط اس وقت کہا جاتا ہے جب دیوار سے کیچڑ مل جائے عام طور پر یہودی ذلیل اور

مسکین ہیں یا تو حقیقتاً اور یا تکلف کے طور پر کہ وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اُن پر جزیہ بڑھا نہ دیا جائے لہذا ان کا مالدار ہونا یا اقتدار پر ہونا اس ذلت کے خلاف نہیں علاوہ ازیں دنیا میں یہودیوں کو ملک اسرائیل میں اقتدار حاصل ہے اور ان کا قتدار بھی دوسرے لوگوں کا مرہون منت ہے امریکہ وغیرہ انکی پشت پر ہے۔

سوال نمبر ۳۷۱: بنی اسرائیل پر ذلت' مسکنت اور غضب کیوں مسلط ہوا قرآن مجید نے اسکی کیا وجہ بیان کی ہے وضاحت سے ذکر کریں نیز وہ انبیاء کرام کو قتل کیوں کرتے تھے؟

جواب: بنی اسرائیل پر ذلت' مسکنت اور غضب مسلط ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے اور انبیاء کرام علیہم السلام کو ناحق شہید کرتے تھے آیات کے انکار سے مراد معجزات کا انکار ہے جس طرح دریا کا پھٹ جانا اور پتھر سے چشموں کا جاری ہونا' من وسلویٰ کا اترنا' تورات' انجیل وغیرہ آسمانی کتابوں کا انکار بالخصوص نبی اکرم ﷺ کی نعت کا انکار جو نعت ان کتب میں مذکور تھی اسی طرح آیت رجم کا بھی انکار کرتے تھے۔

بنی اسرائیل نے حضرت شعیب' حضرت زکریا اور حضرت یحیی علیہم السلام کو شہید کیا اور اس قتل کی وجہ خواشہات کی اتباع اور دنیا کی محبت تھی اور انبیاء کرام علیہم السلام اس سے روکتے تھے۔

سوال نمبر ۳۷۲: ذلك بما عصوا الخ میں ذلك کا تکرار کیوں ہے اور کیا اسم اشارہ مفرد سے دو چیزوں کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے نیز یہاں مصنف نے کس بات کو حسن قرار دیا۔

جواب: کہا گیا کہ اسم اشارہ کا تکرار اس وجہ سے ہے کہ ان کو جو سزا ملی اس کا سبب جس طرح کفر اور انبیا کرام علیہم السلام کو شہید کرنا تھا (ذلك بانهم كانوا يكفرون الخ) اسی طرح گناہوں کا ارتکاب اور حدود خداوندی سے تجاوز بھی اس کا ایک سبب تھا۔ (ذالك بما عصوا وكانوا يعتدون)

یہ بھی کہا گیا کہ اشارہ کفر اور قتل دونوں کی طرف ہے اور بما عصوکی باء مع کے معنی میں ہے اور جب دو چیزوں کو اکٹھا کیا جائے تو اسم اشارہ واحد بھی کفایت کرتا ہے جس طرح یہاں باء کو مع کے معنی میں لیا گیا۔

مصنف فرماتے ہیں حسن بات یہ ہے کہ مضمرات اور مبہمات (اسمائے اشارہ اور اسمائے موصولہ) کا تثنیہ اور جمع بطور حقیقت نہیں ہوتے اسی لیے الذی جمع کے معنی میں آتا ہے۔

سوال نمبر ۳۷۳: ان الذین امنوا سے من امن باللہ تک کے حوالے سے بتائیں کہ جب ایمان والے کہہ دیا تو پھر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ اور الذین امنوا سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: مقصد یہ ہے کہ جو لوگ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں وہ دل سے بھی ایمان لے آئیں۔ یہ منافقین کے بارے میں ہے اور اہل کتاب کے حوالے سے یہ ہے کہ جو لوگ اپنے ادیان کے منسوخ ہونے سے پہلے اپنے دین پر ایمان رکھتے تھے یا یہ کہ ان کفار میں سے جو خالص طور پر ایمان لائے۔

الذین امنوا سے مراد ہے وہ لوگ جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان میں مخلص بھی ہیں ان کو ثابت قدمی کا حکم دیا گیا اور منافق بھی ہیں ان کو دل سے ایمان لانے کی ترغیب اور حکم دیا گیا۔

سوال نمبر ۳۷۴: والذین ھادوا والنصاری الخ کے حوالے سے مفسر کی تحقیق ذکر کریں اور بتائیں کہ صابئین کون لوگ ہیں؟

جواب: ھَادُوْا تَھَوَّدُوْا کے معنی میں ہے کہا جاتا ہے ھَادَ وَ تَھَوَّدَ یہ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص یہودیت میں داخل ہو یہودی یا تو عربی لفظ ہے ھَادَ سے بنا جب توبہ کرے

انہوں نے بچھڑے کی پوجا سے توبہ کی تو ان کو یہودی کہا گیا۔ یا عجمی لفظ ہے اسے معرب کیا گیا یا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے یہودا کے نام پر ان کا نام رکھا گیا۔

نصاریٰ، نصران کی جمع ہے جس طرح ندامی، ندمان کی جمع ہے اور نصرانی میں یا مبالغہ کے لیے ہے جس طرح الحمری میں یا مبالغہ کے لیے ہے چونکہ ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی اس لیے ان کا یہ نام رکھا گیا یا وہ آپ کے ساتھ نصران یا ناصرہ نامی بستی میں تھے اس لیے ان کو نصاریٰ کہا گیا۔ (نصران کے نام پر یا ناصرہ سے مشتق ہو کر ان کا نام بنا)

صابئین مجوسیوں اور نصاریٰ کے درمیان ایک قوم کا نام ہے کہا گیا ہے کہ ان کا اصل دین نوح علیہ السلام کا دین تھا یہ بھی کہا گیا کہ وہ فرشتوں کی پوجا کرتے تھے ایک قول کے مطابق ستاروں کی پوجا کرتے تھے اگر یہ لفظ عربی ہو تو صبا سے مشتق ہوگا اور نکلنے کے معنی میں ہوگا یا صبا سے مشتق ہوگا مائل ہونے کا معنی ہے کیونکہ وہ دوسرے تمام ادیان کو چھوڑ کر اپنے دین کی طرف مائل ہوئے یا حق سے باطل کی طرف مائل ہوئے۔

سوال نمبر ۲۷۵: خوف علیھم ولا ھم یحزنون میں کس خوف اور حزن کی نفی ہے نیز ان الذین امنوا سے آخر تک ترکیب کے حوالے سے مفسر نے کیا فرمایا سیبویہ کا اختلاف اور اس کا جواب کیا ہے؟

جواب: یعنی کفار کو عذاب کا خوف ہوگا اور عمل میں کوتاہی کرنے والے کو عمر کے ضائع ہونے اور ثواب کے فوت ہونے کا غم ہوگا۔

من لمن میں مبتدا ہے فلھم اجرھم اس کی خبر ہے اور یہ پورا جملہ ان کی خبر ہے (ان الذین امنوا میں جوائز ہے) یا ان کے اسم سے بدل ہے اور فلھم اجرھم اس کی خبر ہے اور فاء مسند الیہ (لفظ من) پر متضمن ہونے کی وجہ سے شرط کے معنی میں ہے۔

سیبویہ نے کہا کہ اِنَّ کی خبر پر فاء داخل نہیں ہوتی اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "

ان الذین فتنوا المؤمنین و المؤمنات ثم لم یتوبوا فلهم عذاب جهنم"

میں اِنَّ کی خبر پر فاء داخل ہے۔

سوال نمبر ۳۷۶: بنی اسرائیل سے کیا میثاق لیا گیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھانے کی وجہ اور صورت کیا تھی؟

جواب: بنی اسرائیل سے یہ وعدہ لیا گیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع کریں اور تورات پر عمل کریں ان پر طور کو اٹھانے کی وجہ یہ تھی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس تورات لائے اور انہوں نے اس میں سخت اور مشکل امور دیکھے تو یہ بات ان پر شاق گزری اور انہوں نے انکار کر دیا چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم ہوا تو انہوں نے کوہ طور کو جڑ سے اٹھا کر ان پر لا کھڑا کیا تو انہوں نے تورات کو قبول کر لیا۔

سوال نمبر ۳۷۷: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے ایک فضل کی طرف متوجہ کیا جس کی وجہ سے وہ خسارے سے بچ گئے وہ فضل کیا ہے؟ اور خسارے سے بچاؤ کیا تھا نیز لفظ لو کے بارے میں مصنف نے کیا فرمایا؟

جواب: اس فضل سے مراد ان کو توبہ کی توفیق عطا کرنا ہے یا نبی اکرم ﷺ کی ذات والا صفات اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ آپ ان کو حق کی طرف دعوت دیں گے اور ہدایت کی راہ دکھائیں گے۔ اگر یہ فضل نہ ہوتو وہ گناہوں میں مصروف ہونے کی وجہ سے نقصان اٹھاتے یا نبوت سے خالی زمانے کی وجہ سے خسارہ ہوتا۔

لفظ لو اصل میں ایک چیز کے امتناع کی وجہ سے دوسری چیز کے امتناع کے لیے آتا ہے اور جب یہ حرف (لو) لا پر داخل ہو تو اثبات کا فائدہ دیتا ہے یعنی ایک چیز کے ثبوت سے دوسرے کی نفی مراد ہوتی ہے۔ لہذا یہاں مفہوم یہ ہوگا کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل تھا لہذا

خسارہ نہ ہوا۔

سوال نمبر ۲۷۸: سبت کا کیا معنی ہے اور اس واقعہ کا پس منظر کیا ہے یہ واقعہ کس نبی کے زمانے میں پیش آیا؟

جواب: لفظ سبت مصدر ہے کہا جاتا ہے سبت الیھود جب انہوں نے ہفتہ کے دن کی تعظیم کی گویا یہ تعظیم کا معنی دیتا ہے اس کا لغوی معنی کاٹنا ہے ان کو حکم دیا گیا کہ اس دن کو دوسرے کاموں سے منقطع کر کے عبادت کے لیے خالص کریں یہ لوگ ایلہ بستی میں رہتے تھے جو دریا کے کنارے پر تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تھا ان لوگوں کو ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار کرنے سے منع کیا گیا تو انہوں نے یہ حیلہ اختیار کیا کہ دریا کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے تالاب بنا دیتے تاکہ ان میں مچھلیاں آجائیں اور وہ اتوار کے دن شکار کر لیتے۔

سوال نمبر ۲۷۹: ان لوگوں کو بندر بنانے سے کیا مراد ہے اور خاسئین کی قید کا کیا مطلب ہے نیز لفظ خاسئین اور قردۃ پر مصنف کی بحث ذکر کریں؟

جواب: اس سے مراد انکی شکلوں کو بندروں کی صورت میں بدلنا ہے شعور وغیرہ اسی طرح باقی تھا حضرت مجاہد فرماتے ہیں ان کی صورتیں مسخ نہیں ہوئیں بلکہ ان کے دلوں کو بندروں کی مثل قرار دیا گیا جس طرح فرمایا گیا کہ وہ گدھوں کی طرح ہیں جو بوجھ اٹھاتے ہیں قردۃ، قاف کے فتح کے ساتھ بھی پڑھا گیا اور خاسئین کو ہمزہ کے بغیر خاسین بھی پڑھا گیا خاسئین کی قید سے یہ بتایا گیا کہ دونوں باتیں ہوئیں بندر بنانا اور ذلت و رسوائی بھی، خاسئین یا تو خبر کے بعد خبر ہے یا حال ہے۔

سوال نمبر ۲۸۰: نکالا کسے کہتے ہیں نیز بین یدیھا اور ما خلفھا سے کون لوگ مراد ہیں نیز یہاں متقی لوگوں سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: نکال عبرت کو کہتے ہیں جو شخص اس کو پیش نظر رکھے اسے برے کام سے روکتی ہے

اسی لیے بیڑیوں کو نکل کہتے ہیں بیون یدیھا سے اس سے پہلے کے لوگ مراد ہیں اگر ان سے پہلے کی کتب میں ان کا ذکر ہو ورنہ اس وقت کے لوگ مراد ہوں گے اور ما خلفھا سے بعد والی امتیں مراد ہیں یا وہاں موجود اور دور والے لوگ مراد ہیں یا اس بستی والے اور اسکے مضافات والے مراد ہیں یا پہلے اور پچھلے گناہ مراد ہیں۔ متقی سے اس قوم کے متقی مراد ہیں یا ہر متقی مراد ہے۔

سوال نمبر ۲۸۱: گائے ذبح کرنے کا پس منظر کیا ہے تفصیل سے واقعہ ذکر کریں۔ اور بتائیں کہ اصل واقعہ بیان کرنے سے پہلے گائے ذبح کرنے میں مصنف نے کیا حکمت بیان کی ہے؟

جواب: بنی اسرائیل میں ایک مالدار شخص تھا اس کے بھتیجوں نے اس کے بیٹے کو قتل کیا تاکہ ان کو وراثت مل جائے انہوں نے مقتول کو شہر کے دروازے پر ڈال دیا اور دیت کا مطالبہ کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک گائے ذبح کرکے اس کا گوشت اس مقتول پر مارنے کا حکم دیا تاکہ وہ زندہ ہوکر قاتل کے بارے میں بتائے چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہوا اور اس نے قاتل کے بارے میں بتادیا۔

چونکہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کی برائیوں میں سے ایک مستقل برائی پر مشتمل تھا اس لیے اس کو واقع پہلے الگ طور پر بیان کیا وہ برائی ان کا امر خداوندی کا مذاق اڑانا بار بار سوال کرنا اور تعمیل نہ کرنا تھا۔

سوال نمبر ۲۸۲: لفظ ھزوا کی لغوی تحقیق بیان کریں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مذاق کی نفی کی بجائے "اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین" کیوں فرمایا۔

جواب: ھزو سے مراد مذاق کا محل یا نشانہ یا اہل ھزو یا مھزو (اسم مفعول) یا محض ھزو (مذاق) مراد ہے مبالغہ کے طور پر یوں کہا گیا یعنی جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا

انہوں نے اسے بہت بعید جانتے ہوئے یوں بطور مبالغہ کہا کہ ہمیں مذاق بنا رہے ہیں۔

ھزوا 'ز' اپر ضمہ کے ساتھ اور ھزوا ساکن بھی پڑھا گیا پہلا قول امام حفص کا ہے جو امام عاصم سے روایت کیا دوسرا قول حمزہ اور اسماعیل سے جو نافع سے لیا گیا اور ھمزہ کو واؤ سے بدل کر بھی پڑھتے ہیں۔

آپ نے جامع جواب دیا کیونکہ جہاں یہ بات واضح فرمائی کہ آپ نے ان سے مذاق نہیں کیا وہاں اس بات کو بھی واضح فرمایا کہ مذاق کرنا جاہلوں کا کام ہے اور انبیاء کرام جہالت سے پاک ہونے کی وجہ سے کسی سے مذاق نہیں کرتے نیز یہ ایسا عمل ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا ضروری ہے۔

سوال نمبر ۳۸۳: بنی اسرائیل گائے کی صفت پوچھتے تھے لیکن انہوں نے لفظ ما کے ساتھ سوال کیا جو عام طور پر جنس کے متعلق سوال کے لیے مستعمل ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: لفظ ما عام طور پر جنس کے بارے میں سوال کے موقع پر استعمال ہوتا ہے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ جس گائے کو ذبح کرنے کا ان کو حکم دیا گیا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کی جنس سے کوئی چیز دستیاب نہیں تو انہوں نے اس کو اس کے قائم مقام قرار دیا جس کی حقیقت کو وہ نہیں جانتے اور انہوں نے اس کی مثل نہیں دیکھا لہٰذا ما کے ساتھ سوال کیا کہ وہ کس جنس سے ہے۔

سوال نمبر ۳۸۴: لفظ فارض ' بکر اور عوان پر روشنی ڈالیں؟

جواب: مطلب یہ کہ وہ مسنہ نہ ہو اور مسنہ وہ ہے جو تیسرے سال میں داخل ہو۔ فارض ' لفظ فرض سے بنا ہے جس کا معنی کاٹنا ہے گویا اس کی عمر منقطع ہو گئی اور وہ آخر کو پہنچ گئی۔ اور بکر سے مراد ہر چیز کا اول ہوتا ہے البکرۃ دن کا پہلا حصہ اور الباکورۃ ابتدائی پھل کو کہتے ہیں مطلب یہ کہ بالکل بچی بھی نہ ہو' عوان نصف کو کہتے ہیں یعنی درمیانی عمر والی ہو۔

سوال نمبر ۳۸۵: گائے کے معین ہونے اور وقت خطاب سے بیان کے موخر ہونے پر مصنف نے کیسے استدلال کیا اور اس مسئلہ میں معتزلہ کا کیا مذہب ہے؟

جواب: بنی اسرائیل نے کہا" انا ان شاء الله لمهتدون" بے شک ہم اگر اللہ تعالی نے چاہا تو ہدایت پائیں گے (یعنی ایسی گائے پائیں گے) اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک یہ کہ ہر نو پید کام اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہوتا ہے وجہ استدلال یہ ہے کہ ہدایت پانے کو اللہ تعالی کی مشیت سے معلق کیا گیا اور ہدایت پانا حوادث میں سے ہے لہذا حوادث اللہ تعالیٰ کے ارادے سے وجود میں آتے ہیں۔

معتزلہ کہتے ہیں بعض حوادث بندے کے ارادے سے وجود میں آتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ بعض اوقات حکم اور ارادے میں فصل ہوتا ہے ورنہ گائے ذبح کرنے کا حکم دینے کے بعد انا ان شاء الله کہنے کی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ فوری طور پر عمل کرنا ضروری ہوتا۔ جب کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ امر عین ارادہ ہے اور اللہ تعالیٰ جس بات کا حکم دیتا ہے اس کا ارادہ بھی فرماتا ہے۔

سوال نمبر ۳۸۶: جو لوگ گائے کا تعین نہیں مانتے وہ کیا دلیل دیتے ہیں؟

جواب: بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوئی بھی گائے ذبح کرنے کا حکم تھا وہ کہتے ہیں بیان کو وقت خطاب سے موخر کرنا جائز نہیں اس لیے ان اوصاف کے بغیر کوئی ذبح کی جا سکتی تھی۔ لیکن مصنف علیہ الرحمہ فرماتے ہیں گائے کے ان اوصاف کا بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ معین تھی اور بیان وقت خطاب سے موخر ہو سکتا ہے۔

سوال نمبر ۳۸۷: فافعلوا ما تؤمرون الخ کی تفسیر میں مصنف نے ما تومرنہ (ضمیر منصوب متصل کے ساتھ) کیوں ذکر کیا؟

جواب: فعل امر کا اصل استعمال دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے پہلے مفعول کی طرف

بنفسہ متعدی ہوتا ہے جب کہ دوسرے مفعول کی طرف باء کے واسطے سے۔ لیکن باء جارہ کو اس فعل میں حذف کرنا معروف ہے اور دونوں مفعولوں کی طرف متعدی بنفسہ ہوتا ہے۔ اس لیے مصنف نے ماتومرنہ فرمایا یعنی دوسرا مفعول بھی ذکر کیا اور باء حرف جار کو حذف بھی کیا۔

سوال نمبر ۳۸۸: فاقع کے حوالے سے علامہ بیضاوی کی تشریح وتفسیر کا جائزہ پیش کیجئے نیز سرور کسے کہتے ہیں؟

جواب: فاقع 'الفقوع سے بنا ہے جس کا معنی زردی کا خالص ہونا ہے اس لیے اصفر فاقع بطور تاکید کہا جاتا ہے اور لون (رنگ) کی طرف اسکی نسبت کی گئی حالانکہ یہ صفرا کی صفت ہے' یہ تاکید کی فضیلت کے پیش نظر ہے گویا کہا گیا صفراء' شدید الصفرة صفر تھا' ہوسکتا ہے صفرۃ سے سیاہی مراد ہو کیونکہ شروع میں سیاہی ہوتی ہے یا اونٹوں کی سیاہی پر زردی چڑھی ہوتی ہے لیکن یہ محل نظر ہے کیونکہ اس میں زردی کی تاکید فاقع سے نہیں آتی۔

سرور اصل میں دل کی لذت کو کہتے ہیں جب کوئی نفع حاصل ہو یا اس کی توقع ہو اور یہ لفظ سر سے بنا ہے کیونکہ یہ دل میں ایک راز کی طرح ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۳۸۹: ان البقر الخ کی دوسری قراءت ذکر کریں اور تشابہ کو کون کونسی صورتوں میں پڑھا گیا؟

جواب: ان البقر کو ان الباقر بھی پڑھا گیا اور باقر گایوں کی ایک جماعت کو کہتے ہیں جس طرح الاباقر' اور البواقر' جماعت کو کہا جاتا ہے۔ تشابہ میں مصنف نے سولہ قراءتیں ذکر کی ہیں؟

(۱) تَشَابَهَ: شین کی تخفیف باء اور ہاء کے فتح کے ساتھ عام لوگوں کی قراءت یہی

ہے۔(یہ ماضی کا صیغہ ہے)

(۲) یَتَشَابَہُ: (۳)تتشابہ (۴)تشابہ ایک تاء حذف ہوگئی (مضارع کا صیغہ ہے) اصل میں تتشابہ تھا۔

(۵) یَشَّابَہُ اصل میں یتشابہ تھا تاء کوشین سے بدل کرشین کا شین میں ادغام کیا یشابہ ہوگا۔ یہ مذکر کا صیغہ ہے۔

(٦) تَتَشَابَہُ کی تاء کوشین سے بدل کرشین کا شین میں ادغام کیا تَشَّابَہُ (مونث کا صیغہ ہوگیا)

(۷) تَشَابَہَتْ (بروزن تفاعلت) مونث کا صیغہ ماضی۔

(۸) تَشَّــــابَہَــتْ تاء مشدد ہے لیکن مضارع نہیں اس لیے یہاں تاء کا شین میں ادغام نہیں۔ ممکن ہے ان البقرۃ تشابہت ہوایک تاء بقرۃ کی اور دوسری تاء تفاعل کی اب تفاعل کی تاء کوشین سے بدل کرشین کا شین میں ادغام کیا اب شروع میں ہمزہ لائے کیونکہ ساکن سے ابتداء نہیں ہوسکتی جب لفظ بقرۃ کے ساتھ ملا تو ہمزہ کی ضرورت نہ رہی لہذا وہ گر گیا (تفصیل حاشیہ شیخ زادہ میں دیکھیں)

(۹) تَشَبَّہَ شین اور باء دونوں مشدد ہیں اصل میں تتشبہ تھا دوسری تاء کوشین سے بدل کر ادغام کیا۔

(۱۰) تَشَبَّہَ ماضی مذکر کا صیغہ۔

(۱۳)(۱۴)(۱۵)(۱٦) مُتَشَابِــہٌ ، مُتَشَابِھَۃٌ ، مُتَشَبِّہٌ ، مُتَشَبِّھَۃٌ چاروں اسم فاعل کے صیغے ہیں پہلے دو تشابہ سے اور دوسرے دو تشبہ سے۔ البقر، بقرۃ کی جمع ہے لہذا مونث کا صیغہ جائز ہے کیونکہ فاعل اسم جنس ہے لہذا لفظ کو

دیکھتے ہوئے مذکر کی ضمیر اور جماعۃ کی تاویل کی وجہ سے مونث کا صیغہ لایا گیا ہیں۔

سوال نمبر ۳۹۰: حوادث اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہوتے ہیں اور امر کبھی ارادے سے منفک ہوتا ہے اس موقف پر ہمارے اصحاب کے استدلال کی کیا صورت ہے؟ نیز معتزلہ اور کرامیہ کیا کہتے ہیں اور ان کو کیا جواب دیا گیا ہے؟

جواب: ہمارے اصحاب کا استدلال یوں ہے کہ اهتداء (ہدایت پانے) کو مشیت خداوندی سے متعلق کیا اگرچہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صادر ہوا اور امر بعض اوقات ارادے سے منفک ہوتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ امر کے بعد عمل کو مشیت الہیہ سے معلق کیا گیا اگر امر اور ارادہ ساتھ ساتھ ہوتے تو یہ تعلیق نہ ہوتی۔

معتزلہ اور کرامیہ کہتے ہیں کہ امر عین ارادہ ہے اور اللہ تعالیٰ جس بات کا حکم دیتا ہے اس کا ارادہ بھی کرتا ہے ان کو جواب یوں دیا گیا کہ یہاں تعلیق ہے اور تعلیق حدوث تعلق کو مستلزم ہے۔ اگر ان میں انفکاک ہوتا تو تعلیق نہ ہوتی۔

سوال نمبر ۳۹۱: لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث کی نحوی تحقیق کیا ہے اور اگر لا ذلول کو فتح کے ساتھ پڑھیں تو معنی کیا ہوگا؟

جواب: لا ذلول بقرہ کی صفت ہے اور دوسرا لام زائدہ ہے جو پہلے لام کی تاکید ہے دونوں فعل یعنی تثیر الارض ولا تسقی الحرث ' ذلول کی صفت ہیں یعنی لا ذلول مثیرۃ وساقیہ اور لا ذلول کو فتح کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں لائے نفی جنس ہوگا اور خبر محذوف ہوگی یعنی لا ذلول ثمہ 'یعنی جہاں یہ گئے وہاں کوئی ذلت نہیں ہے۔

سوال نمبر ۳۹۲: مسلمۃ سے کس بات کی طرف اشارہ کیا گیا اور شیۃ کا کیا معنی ہے نیز

یہاں اس سے کیا مراد ہے؟
جواب: یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ گائے عیب سے محفوظ ہے یا اس کے مالک عمل سے بچے ہوئے ہیں یا اس کا رنگ خالص ہے۔

شیۃ کا معنی ہے ایسا رنگ جو اس کی جلد کے رنگ کے خلاف ہو وشاہ وشیا وشیہ (یہ مصدر ہے) جب کسی کا رنگ دوسرے رنگ سے مل جائے یہاں اس کے رنگ کے خالص ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

سوال نمبر ۳۹۳: قالوا الان جئت بالحق الخ الان میں کیا کیا لغات ہیں اور امام بیضاوی رحمہ اللہ نے وما کادوا یفعلون میں کون کونسی وجوہ بیان کی ہیں؟
جواب: الان 'مد کے ساتھ استفہام کے طور پر پڑھا گیا نیز ہمزہ کو حذف کر کے اس کی حرکت لام کو دے کر اَلان بھی پڑھا گیا۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں چونکہ انہوں نے بات کو لمبا کردیا اور بار بار رجوع کرتے رہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گائے کو ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے یا قاتل کا علم ہوجانے کی وجہ سے شرمندگی یا گائے کی قیمت کا زیادہ ہونا ان کو اس عمل سے یعنی ذبح کرنے سے روک رہا تھا۔

سوال نمبر ۳۹۴: لفظ کاد کے بارے میں مصنف علیہ الرحمہ نے کیا لکھا ہے؟ نیز بتایئے کہ فذبحوھا اور وما کادو یفعلون میں بظاہر تعارض کا کیا جواب ہے؟
جواب: کاد 'افعال مقاربہ میں سے ہے اور اس کی وضع خبر کے حصول کو قریب کرنے کے لیے ہے جب اس پر نفی داخل ہو تو بعض نے کہا اس وقت یہ مطلقاً اثبات کا معنی دیتا ہے بعض نے کہا ماضی کے معنی میں ہوتا ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس کا حکم وہی ہے جو باقی افعال کا ہے۔

فذبحوھا اورما کادوا یفعلون میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ دونوں کے

وقت میں اختلاف ہے معنی یہ ہے کہ وہ جب تک سوال کرتے تھے اس وقت تک وہ ذبح کرنے کے قریب نہ تھے لیکن جب سوالات اور بہانے ختم ہو گئے تو وہ ذبح کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جس طرح کوئی شخص کوئی کام کرنا نہیں چاہتا لیکن اسے مجبوراً وہ کام کرنا پڑتا ہے۔

سوال نمبر ۳۹۵: واذ قتلتم میں جمع کی ضمیر کیوں لائی گئی جبکہ قاتل ایک تھا نیز اِذّارأتم کی اصل کیا ہے؟

جواب: چونکہ ان سب میں قتل واقع ہوا اس لیے سب پر ذمہ داری ڈالی گئی اور جمع کا صیغہ لایا گیا۔

ادارأتم اصل میں تدارأتم تھا تاء کا دال میں ادغام کیا گیا اور شروع میں ہمزہ لایا گیا اور یہ باہم جھگڑے کے معنی میں آتا ہے چونکہ وہ لوگ اس قتل کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالتے تھے اس لیے باہم جھگڑے کا ذکر ہوا۔

سوال نمبر ۳۹۶: واعمل مُخرِجٌ لانه حکایة مستقبل الخ اس عبارت کو لانے کا کیا مطلب ہے؟ کسی اعتراض کا جواب ہے تو وہ اعتراض کیا ہے؟

جواب: اعتراض یہ ہے کہ مخرج اسم فاعل ہے اور اسم فاعل اپنے فعل کا عمل اس وقت کرتا ہے جب حال یا استقبال کے معنی میں ہو اور یہاں ماضی کے معنی میں ہے کیونکہ نزول قرآن کی نسبت یہ واقعہ ماضی میں واقع ہوا لہٰذا مناسب یہ ہے کہ مخرج عمل نہ کرے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کے جھگڑے کی نسبت سے یہ عمل مستقبل میں ہوا اور یہاں اس کی حکایت ہے۔

جس طرح اصحاب کہف کے کتے کے بارے میں فرمایا باسط ذراعیہ بالوصید یہاں بھی ماضی کا واقعہ ہے اور باسط اسم فاعل ہے۔ لیکن یہ عمل کی حکایت ہونے کی وجہ سے جائز ہے۔

سوال نمبر ۳۹۷: اضـــربـوه میں ضمیر منصوب نفس کی طرف لوٹتی ہے تو اسے مذکر کیوں لایا گیا نیز ببعضھا میں بعض سے کونسا عضو مراد ہے۔

جواب: اگر چہ یہ ضمیر نفس کی طرف لوٹتی ہے اور نفس مونث ہے لیکن یہاں شخص یا قتیل کی تاویل میں ہے لہذا مذکر کی ضمیر لائی گئی۔

بعض عضو سے مراد سب سے چھوٹا عضو ہے بعض کے نزدیک اس سے زبان مراد ہے کسی نے دائیں ران کا قول کیا یہ بھی کہا گیا کہ کان مراد ہے اور ایک قول کے مطابق گائے کی دم مراد ہے۔

سوال نمبر ۳۹۸: اللہ تعالیٰ نے شروع میں خود ہی قاتل کے بارے میں کیوں نہیں بتایا اور گائے ذبح کرنے کا حکم کیوں دیا اس میں کن کن باتوں کی طرف اشارہ ہے؟

جواب: اس طریقے کو اختیار کرنے میں ان امور کی طرف توجہ دلائی گئی۔

(۱) اس میں قربانی کرنے اور جانور ذبح کرنے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا پایا جاتا ہے۔

(۲) واجب کی ادائیگی۔

(۳) یتیم بچے کو نفع پہنچانا (کیونکہ وہ گائے ایک یتیم بچے کی تھی)

(۴) توکل علی اللہ کی برکت اور اولاد پر شفقت (کیونکہ اس بچے کے والد نے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے گائے کو چھوڑ دیا اور اپنے بچے پر شفقت کے تحت اللہ تعالیٰ سے اس کی حفاظت کی دعا مانگی)

(۵) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ طالب حق کوئی قربانی پیش کرے صدقہ وخیرات کرنے اور طلب حق کی راہ پر چلے۔

(۶) اور قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لیے قیمتی سے قیمتی چیز پیش کی جائے جس طرح نہایت قیمتی گائے کی قربانی دی گئی۔

(۷) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ موثرِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اسباب محض علامات ہیں موثر نہیں ہیں۔

سوال نمبر ۳۹۹: نفسانی خواہشات کے قتل اور گائے کے قتل میں کس کس اعتبار سے مطابقت ذکر کی گئی ہے؟

جواب: نفس کو گائے کی طرح قرار دیا اور نفس سے مراد شہوانی قوت ہے لہٰذا اسے قتل کیا جائے یعنی خواہشات کو ختم کیا جائے۔ اور یہ وہ وقت ہے جب بچپن کی قوت اور بڑھاپے کا ضعف نہ ہو یعنی جوانی کا وقت ہو گویا جوانی درمیانی عمر کی گائے کی طرح ہے اور جس طرح وہ گائے خوبصورت تھی اور دیکھنے والوں کو خوش کرنے والی تھی اسے ذبح کیا گیا اسی طرح جب خوبصورت جوانی ہو لالچ اور حرص نہ ہو ایسے وقت میں اپنے آپ کو اپنے رب کے سامنے پیش کرنا اس عمدہ گائے کو ذبح کرنے کی طرح ہے۔

سوال نمبر ۴۰۰: قساوت قلبی کیا ہے اور ثم لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: قساوت کا لغوی معنی سخت گاڑھا ہونا ہے جس طرح پتھر ہوتا ہے اور دل جب غور و فکر سے دور ہو تو یہ قساوت قلبی ہے اور ثم تراخی کے لیے آتا ہے گویا جب یہ لوگ آیات و معجزات کو دیکھتے ہیں تو ان کے لیئے دل ماننے کے لیے نرم ہونے چاہیں لیکن ان کے دل سخت ہیں لیکن حقیقی طور پر یہ تراخی کے لیے نہیں ہے کیونکہ آیات کو دیکھنے اور دل کی سختی میں فصل نہیں پس جب ثم کو حقیقی معنی پر محمول کرنا صحیح نہیں تو اسکو مجازی معنی پر محمول کیا جائے گا یعنی عقلمند آدمی سے یہ بات بعید ہے کہ وہ آیات خداوندی میں غور نہ کرے۔

سوال نمبر ۴۰۱: اقسیٰ کی بجائے اشد قسوۃ لانے کی کیا وجہ ہے؟ اور محذوف

المضاف واقیم المضاف الیہ مقامہ میں کس بات کی طرف اشارہ ہے؟

جواب: جب فعل ثلاثی مجرد ہو اور رنگ وعیب کے معنی میں نہ ہو تو اسم تفضیل " افعل " کے وزن پر آتا ہے یہاں افعل کی بجائے رشد قسوۃ اس لیے لایا گیا کہ اس میں مبالغہ زیادہ ہے اور یہاں مقصود دل کی سختی کو پتھر کی سختی سے زیادہ قرار دینا نہیں بلکہ یہ بتانا کہ دلوں کی سختی بہت زیادہ ہے اگر دلوں اور پتھروں کا مقابلہ ہوتا تو پھر افعل کا صیغہ ہوتا۔

یہاں لفظ مثل لفظ اشد کی طرف مضاف ہے اور اسے حذف کر دیا گیا اعمش نے اشد کی دال پر فتح پڑھا یعنی اشد مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور ہے اور چونکہ یہ غیر منصرف ہے اس لیے حالت جر میں فتح پڑھا گیا۔

سوال نمبر ۲۰۲: وان من الحجارۃ الخ کس بات کی تعلیل ہے؟ اور پتھر کے شق اور ہبوط سے کیا بات بتانا مقصود ہے؟ نیز تفجر کا حقیقی معنی کیا ہے؟

جواب: یہ تفضیل کی تعلیل ہے یعنی پتھر متاثر ہوتے ہیں چنانچہ بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے بعض سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور بعض اوپر سے نیچے کو گرتے ہیں لہٰذا پتھروں کے مقابلے میں ان دلوں میں سختی زیادہ ہے۔ پتھروں کے شق ہونے اور گرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پتھر اپنے رب کے ارادے کے ساتھ جھک جاتے ہیں جب کہ یہ دل متاثر نہیں ہوتے اور حکم خداوندی کے سامنے نہیں جھکتے۔

تفجر کا معنی کشادگی اور کثرت کے ساتھ نکلنا ہے اور خشیت کا مجازی معنی یعنی تعمیل حکم مراد لیا گیا۔

سوال نمبر ۲۰۳: وما اللہ بغافل عما تعملون سے کس بات کا ارادہ کیا گیا ہے؟

جواب: اس میں اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ دلائل کے ملاحظہ کے باوجود جب تم نے اپنے دلوں کو سخت کر لیا اور تم حکم خداوندی کے سامنے نہیں جھکتے تو تمہارے ان اعمال کا بدلہ دیا

جائے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کے علم وشمار میں ہیں۔

سوال نمبر ۴۰۴: افتطمعون میں کس سے خطاب ہے اور یومنوا لکم سے کیا مراد ہے یہ کن لوگوں کے بارے میں ہے؟

جواب: اس میں نبی اکرم ﷺ اور مومنوں کو خطاب ہے اور یومنوا لکم سے تصدیق مراد ہے یا یہ کہ وہ تمہارے کہنے پر ایمان لائیں۔ مطلب یہ کہ یہودی ایسا نہیں کرتے تو یہ یہودیوں کے بارے میں ہے اور نبی اکرم ﷺ نیز مومنوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ طمع نہ رکھو کہ وہ تمہاری تصدیق کریں گے یا کہنے پر ایمان لائیں گے۔

سوال نمبر ۴۰۵: کون سے یہودیوں نے تورات میں تحریف کی اور کیا تحریف کی نیز اس بات کو یہاں ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: حضور ﷺ کے زمانہ مبارکہ کے یہودیوں کے آباؤ اجداد مراد ہیں انہوں نے تورات میں مذکور نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو بدل دیا اسی طرح آیت رجم میں تبدیلی کی اور اپنی مرضی کی تفسیر کرتے تھے یہ بھی کہا گیا وہ ستر افراد مراد ہیں جن کو طور پر جانے کے لیے منتخب کیا گیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام سنا پھر کہنے لگے ہم نے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تم یہ کام کر سکو تو کرو اور اگر چاہو تو نہ کرو یہ بات یہاں ذکر کر کے بتایا کہ ان لوگوں کے پیشوا اس حالت پر تھے تو اب اگر یہ لوگ بھی اسی قسم کی جہالت کا ثبوت دیتے ہیں تو تعجب کی بات نہیں۔

سوال نمبر ۴۰۶: واذا لقوا الذین امنوا: میں ملاقات کرنے والوں سے کون لوگ مراد ہیں اور قالوا امنا میں ایمان سے کیا مراد ہے نیز واذا خلا بعضھم الی بعض میں فاعل کون ہے اور لبعض مجرور سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: ملاقات کرنے والوں سے منافقین مراد ہیں ایمان سے مراد اس بات کی تصدیق ہے

کہ مسلمان حق پر ہیں اور ان کے رسول وہی ہیں جن کی تورات وانجیل میں خوشخبری دی گئی ہے۔

خلا کا فاعل بھی منافقین ہیں اور الٰی بعض سے مراد وہ ہیں جو ان یہودیوں میں سے منافق نہیں ہیں اور ہوسکتا ہے منافق مراد ہوں۔

سوال نمبر ۴۰۷: بما فتح اللّٰہ سے کیا مراد ہے؟ اور لیحاجوکم عند ربکم من عند کس معنی میں ہے عند ربکم سے کوئی دوسرا مفہوم بھی مراد لیا گیا ہے اگر ایسا ہے تو اس کی وضاحت کیجئے؟

جواب: بما فتح اللہ سے مراد نبی اکرم ﷺ کے اوصاف ہیں جو تورات میں بیان کیے گئے۔ عند ربکم سے مراد یا تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے رب کے نزدیک ہے یا جب تمہارا رب یہ بات ذکر کرے یا جو کچھ تمہارے رب کے رسول کے نزدیک ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ قیامت کے دن تمہارے رب کے پاس ذکر کریں۔

سوال نمبر ۴۰۸: افلا تعقلون کا مفعول کیا ہے؟

جواب: یا تو یہ ملامت کرنے والوں کا کلام ہے تو معنی یہ ہوگا کہ تمہیں سمجھ نہیں کہ وہ اس بات کو لے کر تم سے جھگڑا کریں گے یا اللہ تعالیٰ کا مومنوں کو خطاب ہے کہ تم ان سے ایمان کی طمع کیوں کرتے ہو کیا تمہیں ان کا حال معلوم نہیں اور تم نہیں جانتے کہ ان سے ایمان کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

سوال نمبر ۴۰۹: اولا یعلمون الخ کا فاعل کون لوگ ہیں اور اس میں کس بات کا رد ہے؟

جواب: اس کا فاعل منافقین یا ان کو ملامت کرنے والے ہیں یا دونوں مراد ہیں یا وہ بھی اور وہ بھی جو تورات میں تبدیلی کرتے ہیں۔

اس میں ان لوگوں کے اس خیال کا رد ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی باتوں سے واقف

نہیں اس لیے فرمایا کہ انکی پوشیدہ اور ظاہر تمام باتیں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیں۔

سوال نمبر ۲۱۰: امی کا کیا معنی ہے نیز امانی کا لغوی اور اصطلاحی معنی ذکر کریں اور بتائیں کہ یہاں امانی سے کیا مراد ہے؟

جواب: یہاں امـــی کا معنی کتابت کی معرفت نہ رکھنے والا جاہل ہے چنانچہ یہودیوں میں سے بعض کو امیون کہا گیا کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے کہ تورات کا مطالعہ کرتے اور اس کے مضامین کو سمجھتے۔

الامانی، اُمنیة کی جمع ہے اس کا بنیادی معنی وہ انسانی خواہش جو دل میں چھپا رکھی ہو اس لیے جھوٹ پر بھی اس کا اطلاق ہوگا تمنا کو بھی امنیة کہا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ ان جھوٹی باتوں کا اعتقاد رکھتے تھے جو تحریف کرنے والوں سے حاصل کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جنت میں صرف یہودی داخل ہوں گے نیز انہیں صرف چند دن عذاب ہوگا یہ بھی کہا گیا کہ ان کی ایسی قراءت مراد ہے جو معرفت اور تدبیر سے خالی ہو۔

سوال نمبر ۲۱۱: ظن کسے کہتے ہیں اور یہاں ان لوگوں کی کس بات کو ظن کہا گیا؟

جواب: علم کے مقابلے میں ایسی رائے اور اعتقاد جو قطعی نہ ہو اگرچہ وہ شخص اپنے طور پر اعتقاد جازم رکھتا ہو جس طرح مقلد کا اعتقاد اور کسی شبہ کی وجہ سے راہ حق سے بھٹک جانے والا۔ یہودیوں کے جن عقائد کا پچھلے سوال کے جواب میں ذکر ہوا۔ ان کو ظن قرار دیا گیا۔

سوال نمبر ۲۱۲: ویل کیا ہے اور تکتمون الکتاب میں کتاب سے کیا مراد ہے۔ اور کتابت سے کیا؟ نیز بایدیھم لانے کی کیا وجہ ہے جب کہ کتابت ہاتھ سے ہی ہوتی ہے؟

جواب: ویـــل سے مراد افسوس اور حسرت ہے یہ بھی کہا گیا کہ جہنم کی ایک وادی کا نام ویل ہے جس میں اس قسم کے لوگ داخل ہوں گے اسی لیے اس وادی کو مجازاً ویل کہا گیا کتاب سے مراد وہ کلام ہے جس میں تحریف کی گئی یا جھوٹی تاویلات مراد ہیں اور ایدیھم کا اضافہ

تاکید کے لیے ہے جس طرح کہتے ہیں" کتبتہ بیمینی "میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھا۔

سوال نمبر۴۱۳: ثمنا قلیلا : سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ قیمت پر آیات میں ردوبدل جائز ہے اس کا کیا جواب ہے؟

جواب۔ اس سے دنیوی مال ومتاع مراد ہے اور وہ کتنا زیادہ ہی کیوں نہ ہو اس عذاب کے مقابل میں کم ہے جس کے وہ مستحق ہوئے یہ مطلب نہیں کہ زیادہ قیمت پر ردوبدل جائز ہے جتنا بھی لیا جائے وہ قلیل ہی ہوگا۔

سوال نمبر۴۱۴: مس اور لمس میں کیا فرق ہے نیز ایاما معدودۃ سے کون سے دن مراد ہیں؟

جواب: المس ایصال الشی بالبشرۃ بحیث تتاثر الحاسۃ بہ کسی چیز کو جلد تک اس طرح پہنچانا کہ محسوس کرنے والی قوت اس سے متاثر ہو مس کہلاتا ہے۔ اور لمس اس کے لیے طلب کی طرح ہے کہا جاتا ہے المسہ فلا اجد میں اس کو طلب کرتا ہوں لیکن نہیں پاتا۔

ایام معدودۃ سے چند گنتی کے دن مراد ہیں ایک روایت میں ہے کہ ان میں سے بعض نے کہا کہ ہمیں صرف چالیس دن عذاب ہوگا اور وہ بچھڑے کی پوجا کے دن ہیں بعض نے کہا دنیا کی کل مدت سات ہزار سال ہے اور ہمیں ہر ہزار سال کی جگہ ایک دن عذاب ہوگا۔

سوال نمبر۴۱۵: قل اتخذ اللہ عہدا کی تفسیر میں خبر اور وعدہ فرمانے میں کیا حکمت ہے؟ نیز فلن یخلف اللہ عہدہ جواب شرط ہے اس کی شرط کیا ہے؟ اور "وفیہ دلیل علی ان الحلف فی خبر محال" کی وضاحت کریں؟

جواب: عہد کی تفسیر خبر اور وعدہ سے کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ یہاں عہد کا حقیقی معنی مراد نہیں کیونکہ یہ دو آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے وقوع کا وہم بھی نہیں ہوتا بلکہ مجازی معنی مراد ہے اور وہ خبر یا وعدہ ہے۔

فلن یخلف اللہ کی شرط مقدر ہے یعنی " ان اتخذتم عہد اللہ عہدا فلن یخلف اللہ عہدہ" اور فیہ دلیل میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو وعدہ فرماتا ہے یا خبر دیتا ہے اسے پورا کرتا ہے فلن یخلف اللہ میں اس بات کی دلیل ہے اہل سنت و جماعت کا یہی عقیدہ ہے۔

سوال نمبر ۴۱۶: ام تقولون الخ میں لفظ " ام "کونسا ہے جو صورت مراد ہو اس کے اعتبار سے معانی کی وضاحت کریں؟

جواب:" ام "ہمزہ استفہام کے مساوی ہے یعنی دو باتوں میں سے جو بھی ہو اس صورت میں یہ بات یقینی ہوتی ہے کہ دونوں میں سے ایک ضرور واقع ہے مطلب یہ ہوگا کہ یا تو تم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لیا یا تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہو ایک بات ضرور ہے۔

یا ام منقطعہ بل کے معنی میں ہے یعنی کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لیا نہیں بلکہ تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہو۔

سوال نمبر ۴۱۷: بلی من کسب سیئۃ الخ میں بلی کے حوالے سے مفسر کی تقریر ذکر کریں اور سیئۃ و خطیئۃ میں فرق کی وضاحت کریں؟

جواب: یہودیوں نے کہا تھا کہ انہیں طویل مدت عذاب نہیں ہوگا اس کی نفی کرتے ہوئے عمومی طریقہ اختیار کیا اور بتایا کہ جو گناہ کرے گا (یہاں کفر مراد ہے) وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا صرف یہودیوں کے لیے نہیں بلکہ اس قسم کے دوسرے لوگوں کو بھی شامل کر کے عام حکم بیان کیا اور بلی منفی بات کو ثابت کرنے کے لیے آتا ہے یعنی نفی کو توڑ دیتا ہے چاہے وہ نفی

استفہام سے خالی ہو جیسے ما قام زید یا استفہام سے متصل ہو جیسے الست بربکم
سیئہ کا معنی قبیحہ ہے خطیئہ اور سیئہ میں فرق یہ ہے کہ بالذات جس کا قصد کیا
جائے اسے بعض اوقات سیئہ کہتے ہیں اور خطیئہ کا لفظ عام طور پر اس گناہ پر بولا جاتا ہے
بالذات جس کا ارادہ نہ کیا ہو کسب، نفع حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں محض عمل کے معنی
میں ہے یعنی برائی کمانا۔

سوال نمبر ۴۱۸: واحاطت بہ خطیئتہ کے ضمن میں احاطہ کے حوالے سے مصنف کی
تفصیلی گفتگو کا خلاصہ ذکر کریں؟

جواب: مفسر کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ کافر اور مسلمان میں یہ فرق ہے کہ اگر مسلمان
تصدیق اور اقرار کے علاوہ کوئی نیک کام نہ کرے پھر بھی گناہ اس کا احاطہ نہیں کرتے جب
کہ کافر پر ان گناہوں کا غلبہ اس طرح ہوتا ہے کہ گویا گناہوں نے اسے گھیر لیا۔
تفصیل یہ ہے کہ جو شخص گناہوں میں مبتلا ہو اور ان کو نہ چھوڑے تو اس کی عادت
بن جاتی ہے اور اب یہ گناہ اس کے دل کو گھیر لیتے ہیں حتی کہ وہ طبعی طور پر گناہوں کی طرف
مائل ہو جاتا ہے ان کو اچھا سمجھتا ہے اور اس کا عقیدہ ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی لذت نہیں
اور منع کرنے والے سے بغض رکھتا ہے کسی خیر خواہ کی بات نہیں مانتا جب کہ مومن کا ایمان
اسے اس انہماک سے دور رکھتا ہے لہذا گناہ اس کا احاطہ نہیں کرتے۔

سوال نمبر ۴۱۹: فاولئك اصحاب النار سے کبیرہ گناہ کے مرتکب کے ہمیشہ ہمیشہ جہنم
میں رہنے کی نفی کیسے ہوتی ہے؟

جواب: اس سے مراد کفار ہیں کیونکہ خطیئہ سے مراد کفر ہوگا چونکہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کافر
نہیں لہذا وہ اس میں ہمیشہ نہیں رہیں گے اور خطیئہ سے مراد گناہ کبیرہ ہو تو اس سے مراد یہ
ہے کہ وہ لوگ جو زندگی کے آخری دم تک کبیرہ پر مصر رہے اور توبہ کے بغیر مر گئے اور خلود سے

عرصہ دراز تک جہنم میں رہنا مراد ہوگا ہمیشہ کے لیے نہیں۔

سوال نمبر ۴۲۰: والذین امنوا وعملوا الصالحات کی تفسیر میں مصنف رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کی ایک عادت بیان کی ہے وہ کیا ہے اور اسکی وجہ کیا ہے نیز اس آیت سے کیسے ثابت ہوتا ہے کہ عمل ایمان سے خارج ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی عادت مبارکہ ہے کہ وعید کے ساتھ وعدہ کا ذکر بھی کرتا ہے تاکہ اس کی رحمت کی امید کی جائے اور اس کے عذاب سے ڈرا جائے۔

عملوا الصالحات کے امنوا پر عطف سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اعمال صالح الگ الگ ہیں اور عمل ایمان سے خارج ہے۔